

عزیز مسیحا



خوب سے خوب تر کتابوں کی اشاعت
جبریت اور معیار کے ساتھ

با اہتمام..... محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول..... 2012ء

مطبع..... نیر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ..... کلائمکس گرافکس

قیمت..... روپے

فہرست

5مقتول مسیحا
61دوست دشمن
116جان لیوا
171مصیبت زدہ

مقتول مسیحا

ڈاکٹر کی اہمیت سے ہر کوئی واقف ہے۔ دنیا کے ہر معاشرے میں ڈاکٹر کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے رتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسے ”مسیح“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہونا اور ڈاکٹری کرنا وہ واحد پیشہ ہے جس میں عزت، دولت اور شہرت ایک ساتھ برستی ہے۔ بشرطیکہ ڈاکٹر قابل ہو اور وہ خلوص نیت سے بیماروں کا علاج کرتا ہو۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بھی ایک ڈاکٹر ہی تھا۔ گے کے محلے میں وہ کی ٹاکہ سے بھی چار ہاتھ آگے ہی تھا۔ ظاہر ہے، وہ ڈاکٹر کی پڑھ کر ہی ڈاکٹر بننا تھا اسی لیے بیماروں کا علاج کرنا تھا مگر مریض سے زیادہ توجہ اور نگاہ اس کی جیب پر رکھتا تھا۔ وہ اپنے پاس آگے کے مصیبت زدہ شخص کو ایک نظر دیکھ کر اور اس سے دو باتیں کر کے جیب میں بچا ہوا کھانا نکال کر علاج معالجے کے سلسلے میں وہ اس کی جیب سے کتنی رقم نکال سکتا ہے۔ اس کی مرضی اور مریض کی نفسیات پر منحصر ہوتا کہ وہ ایک ہی ”قسط“ میں نمٹ جائے یا اگلے دن کے لیے مٹ چکے ہو۔ آسان اقساط ہوا لے۔

غریب مریضوں سے دس بیس روپے لے کر وہ ازراہ ہمدردی انہیں لے پی سی، ایس ڈی زید، بی کمپلیکس اور کارمینٹیکس وغیرہ دے کر خیر دیا کرتا تھا، زیادہ سے زیادہ ہوا تو ایک آدھ ڈیکسا کا انجکشن ٹھونک دیا کرتا۔ اللہ، خیر سلا..... اور یہ غریب خراب و تھکی اس واجبی سے علاج سے ”خیر سلا“ ہو بھی جاتے تھے۔

مریض اللہ کے بعد سب سے زیادہ بھرپور سا ڈاکٹر یعنی اپنے مساجد کرتا ہے۔ انسان کا

یقین بڑے معجزاتی اثرات کا حامل ہوتا ہے اور اگر یہ یقین خدا کی ذات پر ہو تو پھر سب کچھ ممکن ہے۔

اس کہانی کی تمہید میں، میں نے جس ڈاکٹر کا ذکر کیا ہے بلکہ جس کا تعارف کرایا ہے اس کا نام مریات تھا۔ ”تھا“ کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ جب اس کی ذات سے میرا پہلا ملا پڑا تو وہ اپنی عمر اور حیات کو بھگتا چکا تھا۔ اس کی داستان تلخ بیان ناصر اینڈ کمپنی کے توسط سے مجھ تک پہنچی تھی۔ ناصر کی حیثیت اس کیس میں ملزم کی تھی اور ”اینڈ کمپنی“ سے میری مراد اس کی فیملی، اس لے کلمہ والے ہیں۔ ناصر پر ڈاکٹر عمر حیات کو قتل کرنے کا الزام تھا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے، اس ماہ میں نے کہانی کی ابتدا، سا لہا سال سے چلی آنے والی روایت سے خاصا ہٹ کر کی ہے۔ آپ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ دراصل اس مال اور اس سے پہلے گزر جانے والے سال کے دوران میں، ہمارے ملک میں درجنوں کام ایسے ہوئے ہیں جن کی مثال پاکستان کی اکٹھ سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ شاید اسی متغیر سیاسی اور انقلابی معاشرتی فضا کا رنگ مجھ پر بھی غالب آ گیا ہے۔ بہر کیف..... زیر نظر قصہ چونکہ ماضی بعید سے تعلق رکھتا ہے لہذا میں ماضی قریب کے ٹرانس سے نکل کر اپنے روایتی رنگ کی طرف واپس آتا ہوں تاکہ آپ کی طبیعت اور عادت کو کسی نئے امتحان سے نہ گزرنا پڑے۔

وہ ماہ فروری کے ابتدائی ایام تھے۔ میں حسب معمول اپنے آفس میں بیٹھا اپنے پاس آنے والے کلائنٹس کو قانونی مدد اور تعاون بہم پہنچانے میں مصروف تھا۔ شام، رات کے گلے گل کر اس لے وجود میں فنا ہو چکی تھی۔ رات نے اپنے سیاہ پر پھیلا کر ہر شے کو تاریکی میں چھپانے کی اپنی اندری کوشش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ موسم معتدل تھا حالانکہ پورے ملک میں اچھی خاصی سردی پڑنے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں لیکن کراچی کا ایک اپنا مزاج اور انداز ہے جو ملک کے سارے شہروں سے لگا نہیں کھاتا۔ اس سال کی سردی کو ”چندر روزہ“ کہا جاسکتا تھا۔

میں ایک کلائنٹ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک جوڑا میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ میری بلڈ میٹری نے ان کی آمد کی اطلاع مجھے پیشگی دے دی تھی۔ وہ اپنا ٹکٹ کے بغیر آئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی ہنگامی اور سنگین نوعیت کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ اگر روٹین کا کوئی معاملہ ہوتا تو وہ یقیناً مجھ سے ملاقات کے لیے پیشگی وقت لے لیتے۔

میں نے اپنی عادت کے مطابق، پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ باڈی لینگوئج اور چہرے کے تاثرات سے میاں بیوی نظر آتے تھے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ مرد کی عمر پچپن کے اریب قریب دکھائی دیتی تھی۔ رنگت سانولی اور چہرے پر ہلکی ڈاڑھی موجود تھی۔ وہ دراز قامت اور متناسب جسم کا مالک تھا۔ اس کے برعکس عورت گوری چٹی، پست قامت اور اچھی خاصی فربہ تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر نظر کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے آس پاس رہی ہوگی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آ گیا اور باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔ ”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
مرد نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! میرا نام نصیر شاہ ہے اور یہ میری بیوی فریدہ ہے۔“ پھر اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی عورت کی جانب دیکھا اور مزید بتانے لگا۔
”ہم اپنے بیٹے ناصر محمود کے لیے بے حد پریشان ہیں اور اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”آپ کے بیٹے کو کیا ہوا ہے شاہ جی؟“ میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

نصیر شاہ نے دھکی لہجے میں بتایا۔ ”ناصر کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے!“
میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”پولیس نے آپ کے بیٹے کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“

”ناصر پر قتل کا الزام لگایا جا رہا ہے.....!“ اس نے جواب دیا۔
”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”پولیس نے آپ کے بیٹے پر کس شخص کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا ہے؟“

”ڈاکٹر عمر حیات!“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔
”یہ کب کا واقعہ ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ”میرا مطلب ہے، آپ کے بیٹے ناصر کو کب گرفتار کیا گیا ہے؟“

”دو دن پہلے..... چار فروری کو!“ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ.....!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ’اگلے روز یعنی پانچ فروری کو اسے عدالت میں پیش کر کے پولیس نے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا اور اس وقت وہ تھانے کی حوالات میں بند ہوگا؟“

”جی ہاں یہی صورت حال ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”آپ کے بیٹے کو کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ”گھر سے۔“

”میں ذرا تفصیل سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے بیٹے اور مقتول کا آپس میں کیا تعلق تھا؟“ میں نے نصیر شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پولیس کے پاس گرفتاری کا جواز کیا ہے؟“ میں نے لچاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”کیا ملزم اور مقتول کے درمیان کسی قسم کی کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟“

”نہ کوئی دشمنی اور نہ ہی کوئی جھگڑا جناب!“ فریدہ نے پہلی مرتبہ لب کشائی کرتے

ہوئے بتایا۔ ”میرا بچہ ناصر تو بڑا ہی شریف اور خوش اخلاق ہے۔ ڈاکٹر عمر حیات تو اس کی بڑی تعریف کیا کرتا تھا۔ پتا نہیں..... یہ اچانک سب کیا ہو گیا ہے.....؟“

”ایک منٹ.....!“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”فریدہ جی! آپ کی

وضاحت سے تو لگتا ہے، ناصر کا مقتول ڈاکٹر کے ساتھ خاصا گہرا تعلق تھا؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وکیل صاحب!“ فریدہ نے تائیدی انداز میں گردن

ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ناصر، دراصل ڈاکٹر عمر کے پاس کمپوڈری (کمپاؤنڈری) کرتا تھا۔“

فریدہ کی بات مکمل ہوئی تو نصیر شاہ نے تفصیلات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔ ”وکیل

صاحب! ناصر کوئی چار سال سے اس کلینک میں کام کر رہا تھا لیکن اس کی ذات کے حوالے سے آج

تک کوئی معمولی سائنسی واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ وہ دونوں ڈاکٹروں کی نظر میں معتبر اور امن پسند لڑکا

تھا۔ پتا نہیں، یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا؟ ہم اچانک ہی اس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“

”آپ نے دونوں ڈاکٹروں کا ذکر کیا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت

کیا۔ ”کیا اس کلینک پر مقتول کے علاوہ کوئی اور ڈاکٹر بھی بیٹھا کرتا ہے؟“

نصیر شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”وکیل صاحب! میں نے جس کلینک کی بات کی

ہے ناس کا نام ”کشور کلینک“ ہے اور یہ دن رات..... یعنی چوبیس گھنٹے کا کلینک ہے۔ دن میں ڈاکٹر یاور عباس بیٹھتا ہے جس کے ساتھ آصف نامی ایک لڑکا ڈسپنسر کے طوپر کام کرتا ہے اور رات میں ڈاکٹر عمر حیات، ناصر کی مدد سے کلینک سنبھالتا تھا لیکن..... وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔

”ڈاکٹر عمر حیات اور ڈاکٹر یاور عباس میں بڑا ہی قریبی رشتہ بھی ہے۔ مقتول عمر حیات، ڈاکٹر یاور کا ماموں لگتا ہے..... میرا مطلب ہے، ماموں لگتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں ڈاکٹروں کی عادات اور مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ڈاکٹر یاور اگر روشن دن ہے تو ڈاکٹر عمر تاریک رات تھا۔ میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دونوں ایک ساتھ مل کر کس طرح کلینک چلا رہے تھے.....؟“

”میں نے ناصر سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ وہ دن کی ڈیوٹی لگوالے۔“ فریدہ نے کہا۔ ”لیکن وہ کہتا تھا کہ ڈاکٹر عمر نہیں مانتا۔ اسے ناصر کے ساتھ ہی کام کرنے میں مزہ آتا ہے..... دیکھ لیں، اس مزے نے کیا کام دکھایا ہے..... ہم تو ایک عذاب میں گرفتار ہو گئے ہیں۔“

وہ دونوں باری باری مجھے اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کر رہے تھے اور میں ان کی بتائی ہوئی تفصیل میں سے اہم پوائنٹس اٹھا کر ریف پڑ پڑ کر پڑھتا جا رہا تھا۔ آئندہ ایک گھنٹے میں انہوں نے مجھے وہ تمام باتیں بتا دیں جو وہ جانتے تھے۔ میں نے گھما پھرا کر ان سے مختلف سوالات بھی کیے۔ ان میاں بیوی سے حاصل ہونے والی معلومات کو میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں مگر اختصار کے ساتھ تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں اور آگے بڑھتے ہوئے آپ کو کوئی الجھن محسوس نہ ہو۔



ملازم ناصر محمود کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا اور یہ فیملی صرف چار افراد پر مشتمل تھی۔ میں نے ”لوئر مڈل کلاس“ کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اس زمانے میں اس ”کلاس“ کا وجود واقعی قائم تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صرف تین کلاسز یعنی لوئر، مڈل اور اپر باقی رہ گئیں اور ان دنوں تو مڈل کلاس بھی غائب ہو گئی ہے۔ اس درمیانی کلاس سے تعلق رکھنے والے افراد میں سے

جنہوں نے (جیسے تیسے بھی سہی) ہاتھ پاؤں ”ماز“ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ اپر کلاس میں چلے گئے ہیں اور جو ”مناسب“ انداز میں ہاتھ پاؤں کو ”حرکت“ نہیں دے سکے، مہنگائی کے طوفان نے انہیں چٹکیوں میں مسل کر لوئر کلاس میں پھینک دیا ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں صرف دو ہی کلاسز ہیں۔ ایک کلاس سے تعلق رکھنے والے لوگ بڑی آسانی سے ایک روٹی ہزار روپے میں بھی خرید سکتے ہیں، دولت ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ دوسری، وہ کلاس ہے جن کا ہر مسئلہ دولت کی غیر موجودگی یا کمی سے پیدا ہوتا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے وجود میں سے درجنوں مسائل کو جنم دے کر خود بھی زندہ رہتا ہے۔ یہ بے کس اور بے بس، لاچار لوگ تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہر روز اپنی روزمرہ کی خوراک میں سے ایک نوالہ کم کرتے جا رہے ہیں۔ اس ”مقابلے بازی“ کا انجام فاقہ کشی ہے۔ جلد یا بدیر..... اس سے کیا فرق پڑتا ہے!

جس معاشرے میں انسانوں کی نظروں کے سامنے انسانیت کی تذلیل ہو رہی ہو اور اس ٹل سے کوئی فرق بھی نہ پڑے، وہ معاشرہ بے حسی کی انتہا کو پہنچ کر مفلوج ہو جایا کرتا ہے۔ ملکوں، قوموں اور معاشروں کی مجموعی تباہی و بربادی کے لیے عوام سے نہیں، خواص سے باز پرس کی جائے گی اور ان خواص میں سے صاحب اقتدار اور صاحب اختیار افراد کو ایک دن اس حاکم اعلیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ یہی اس کا قانون ہے، یہی اس کا دستور ہے۔ وہ آفاقی قانون اور آئین کی خلاف ورزی کو پسند نہیں کرتا!

فریدہ ایک گھریلو عورت تھی۔ نصیر شاہ، سائٹ کے علاقے میں واقع ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا تھا۔ ناصری چھوٹی بہن شازیہ ان دنوں گریجویشن کے فائل میں تھی۔ ناصر نے خود انٹر سائنس کر رکھا تھا۔ انٹر کے امتحانات میں کم نمبر آنے کے سبب وہ میڈیکل کالج میں نہیں جاسکا تھا۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ نصیر شاہ کی بھی معاشی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ بیٹے کو ڈاکٹر بناتا۔ بہر حال، دلبرداشتہ ہو کر ناصر نے پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا اور چند ماہ کی آوارہ گردی کے بعد ”خط پڑھ کے تیرا آدھی ملاقات ہوگئی۔“ کے مصداق، کمپاؤنڈری کو آدھی ڈاکٹری سمجھتے ہوئے وہ ڈسپنسر بن گیا۔

”کشور کلینک“ گلشن اقبال کے گنجان آباد رہائشی علاقے میں واقع تھا۔ ان دنوں ڈے اینڈ نائٹس کلینکس کا نیا نیا رواج شروع ہوا تھا۔ کہنے کو یہ چوبیس گھنٹے کے کلینکس تھے لیکن یہاں بھی چوبیس گھنٹے کا مطلب چوبیس گھنٹے نہیں تھا۔ ان اوقات میں مختلف نوعیت کے ”وقتے“ بھی ہوا کرتے

تھے۔ مثلاً وقفہ برائے فلاں اور وقفہ برائے فلاں وغیرہ وغیرہ!

ڈاکٹر یاور عباس کی ڈیوٹی صبح، یعنی دن گیارہ بجے سے سہ پہر دو بجے تک ہوتی تھی پھر وقفہ برائے کھانا اور آرام کے لیے ڈاکٹر اپنے گھر چلا جاتا۔ شام کو چھ بجے وہ دوبارہ تشریف لاتا اور پھر رات گیارہ بجے تک وہ کلینک میں مریضوں کے ساتھ مصروف رہتا تھا۔ اس کی رہائش حسن اسکوائر کے علاقے میں تھی۔

ڈاکٹر عمر حیات یعنی مقتول رات گیارہ بجے کلینک پہنچتا تھا پھر وہ صبح چھ یا سات بجے وہاں سے رخصت ہوتا تھا۔ وہ صبح میں کسی سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتا تھا۔ ظاہر ہے، دن اور رات کے ابتدائی حصے کی بہ نسبت رات کے آخری حصے میں مریضوں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی لیکن وہ ”ٹارگٹ“ کے معاملے میں اپنے بھانجے ڈاکٹر یاور عباس کو ہمیشہ مات دے دیا کرتا تھا اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

ڈاکٹر یاور عباس مزاجاً و فطرتاً ہمدرد اور خدا ترس واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے پاس آنے والے مریضوں کو میس، تیس روپے کی دوا دے کر فارغ کر دیا کرتا تھا جبکہ اس کے ماموں مقتول عمر حیات کی طبیعت اور فطرت بڑی دکھری ٹائپ کی تھی۔ وہ خاصاً موقع پرست، خود غرض اور کاروباری واقع ہوا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ آدھی رات کے بعد کلینک کا رخ وہی لوگ کرتے ہیں جن کے ساتھ کوئی ایمر جنسی ہو، یعنی ان کی کوئی مجبوری کھینچ کر انہیں کلینک تک لے آتی تھی لہذا ایسے لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ بے تکلف دوستوں میں برملا کہا کرتا تھا کہ میں کوئی الو نہیں ہوں جو رات رات بھر جاگ کر گزار دوں۔ بھائی، مریض کی راہ دیکھنے کے لیے مجھے نیند سے لڑنا پڑتا ہے۔ یہ جنگ میں خواجہ تو نہیں کرتا، اتنی بڑی تکلیف اٹھانے کے لیے مجھے اور کلینک کو بہت زیادہ فائدہ تو ہونا ہی چاہیے نا چنانچہ وہ مریض بہ الفاظ دیگر مریض کے لواحقین کی کھال اتارنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔

اگر کسی مصیبت زدہ نے اس کے پاس آ کر پیٹ میں درد کی شکایت کردی تو سمجھیں کہ اس کی جیب کا جنازہ نکل گیا۔ درد معمولی نوعیت کی بدقسمتی کا ہو یا گردے، پتے اور اپنڈیکس وغیرہ کا، ڈرپ تو لازماً پڑھے گی۔ ایک آدھ دست آ گیا تو ڈرپ اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ زندہ رہنے کے لیے آکسیجن ضروری ہوتی ہے۔ اگر سینے میں بھاری پن ہے چاہے وہ تیزابیت کے باعث ہی کیوں

نہ ہو، ای سی جی ضروری ہوگی۔ ان دنوں ای سی جی اور الٹراساؤنڈ مشین نئی نئی متعارف ہوئی تھیں۔ میری مراد کلینکس پر متعارف ہونے سے ہے، بڑے اسپتال وغیرہ میں تو وہ پہلے سے استعمال ہو رہی تھیں۔ سونوگرافی کو عام طور پر عورتیں ٹی وی والا ایکس رے کہتی تھیں۔ خوشخبری کی حامل خواتین کی سونوگرافی تو مقتول کے معمول میں شامل تھی۔ الغرض، مقتول عمر حیات جب تک کسی مریض کو دو، ڈھائی سو ٹھوک نہ دیتا، اسے چین نہیں ملتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اوسطاً تین، چار مریض ”دیکھ“ کر بھی اپنے بھانجے کے تیس چالیس مریضوں سے ہونے والی آمدنی پر سبقت لے جاتا تھا..... کیا کہیں جناب! یہ تو اپنے اپنے رواج اور طریقہ واردات کی بات ہے!

ان دنوں ڈاکٹروں کے اوصاف و خصائل کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا تو یہی نتیجہ سامنے آتا تھا کہ وہ الگ الگ دنیاؤں کے باسی ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ مختلف سیاروں کی مخلوق ہونے کے باوجود ایک ہی سیارے پر بسنے کے لیے کیوں مجبور تھے؟

یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ یاور عباس انہی عادات کی بنا پر اپنے ماموں کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے سب معلوم ہو جاتا تھا کہ رات کو اس کلینک میں کس رنگ اور ڈھنگ میں مریض دیکھے جاتے ہیں۔ اکثر مریض جو رات کو مقتول کو ”دکھا“ کر گئے ہوتے تھے، دن میں یاور عباس سے دوا لینے آتے تھے تو ماموں جان کی پول پٹیاں کھل کر سامنے آ جاتی تھیں۔ یاور عباس دل سے خواہاں تھا کہ وہ عمر حیات سے الگ ہو جائے لیکن فی الحال یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کی ممی تاہید کا جھکاؤ اپنے بھائی جان یعنی عمر حیات کی جانب تھا۔ وہ اپنی ممی کو ناراض کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کی مرضی سے باہر قدم رکھ سکتا تھا۔ لہذا وہ ”ماموں“ نامی تلخ اور کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور تھا۔

ان تین کرداروں کی ازلی مثلث نے ہر دور میں بڑے حیرت انگیز اور عجیب و غریب واقعات کو جنم دیا ہے اور دیکھنے میں عموماً یہی آیا ہے کہ اس نوعیت کی داستانوں میں ممی اپنے بھائی جان کی محبت سے مغلوب اور ڈکٹیٹر، بھانجا صاحب اپنی ممی کے حکم کے سامنے مجبور و بے بس اور حضرت ماموں کی پانچوں، دسوں گگی میں۔ گویا وہ اس کھیل میں کسی شاطر کمانڈر کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی ہر چال اپنے فائدے سے شروع ہو کر اپنے فائدے پر ختم ہوتی ہے۔ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ایسی کہانیوں کا انجام بڑا دردناک اور عبرت انگیز ہوا کرتا ہے!

دن کی شفٹ میں کام کرنے والا ڈسپنسر آصف صبح دس بجے کلینک پہنچتا تھا۔ کم و بیش اسی

وقت سوپر بھی آتا جو کلینک کی صفائی وغیرہ کرتا۔ جب دن میں یا درعباس گھر چلا جاتا تو ڈپنسٹر کو کلینک ہی میں موجود رہنے کا حکم تھا۔ اس دوران میں آنے والے عام نوعیت کے مریضوں سے وہ کہہ دیتا کہ شام کو چھ بجے کے بعد آئیں اور اگر واقعی کوئی ایمرجنسی کیس ہوتا تو آصف فون کر کے یا درعباس کو بلا لیا کرتا تھا۔ البتہ، وہ اپنی سہولت اور گنجائش دیکھتے ہوئے کبھی کبھار گھر کا چکر بھی لگا آتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان اوقات میں مریض کلینک کا رخ نہیں کرتے تھے اور آصف عموماً دروازے کو لاک کر کے اندر ہی سو جاتا تھا۔

ناصر رات کو دس بجے ڈیوٹی پر پہنچتا۔ دس سے گیارہ بجے تک دونوں کپاؤنڈرز مل کر چلتے تھے پھر مقتول عمر حیات کی آمد کے ساتھ ہی آصف کی چھٹی ہو جاتی۔ آصف، پی آئی بی کالونی میں رہتا تھا۔ ڈاکٹر یا درعباس آصف ایک ساتھ ہی کلینک سے نکلتے تھے۔

یہ تمام معاملات معمول کے مطابق چل رہے تھے کہ چار فروری کی صبح پتا چلا کہ رات کی ڈیوٹی والے ڈاکٹر عمر حیات کو کلینک کے اندر قتل کر دیا گیا ہے.....!



میں ایک ٹک اپنے سامنے بیٹھے اس دکھی جوڑے کو دیکھ رہا تھا جن کا لخت جگر قتل کے الزام میں اس وقت تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ناصر نے ڈاکٹر عمر حیات کو قتل نہیں کیا۔ پولیس کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ عمر حیات کے قتل سے ناصر کا دور دور کا واسطہ نہیں، اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں الجھایا گیا ہے۔ نصیر شاہ مجھے حالات سے آگاہی دینے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے اس سے سوال کیا۔

”شاہ جی! چار فروری کو جب آپ کے بیٹے کو گھر سے گرفتار کیا گیا تو اس وقت آپ گھر کے اندر موجود تھے؟“

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں اس وقت اپنی فیکٹری میں تھا۔ فریدہ نے دوپہر کے وقت فیکٹری فون کر کے مجھے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور ناصر کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ میں، جتنی جلدی ممکن ہو سکا، فیکٹری سے گھر پہنچا پھر محلے کے ایک دو معتبر افراد کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ گیا جہاں مجھے پتا چلا کہ ناصر کو ڈاکٹر عمر حیات کے قتل کے الزام میں

گرفتار کیا ہے۔ یہ ہے جناب کل کہانی.....!“

”آپ نے پولیس والوں سے پوچھا تو ہوگا کہ ناصر کی گرفتاری کی وجوہات کیا ہیں؟“
میں نے دریافت کیا۔ ”مطلب یہ کہ ڈاکٹر کے قتل کے حوالے سے ان کا شک آپ کے بیٹے ہی کی طرف کیوں گیا؟“

”میں نے ان سے پوچھا تھا..... بہت پوچھا تھا لیکن انہوں نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔“ نصیر شاہ نے روہائی آواز میں بتایا۔ ”وہ بس ایک ہی بات کہہ رہے ہیں کہ جو بھی معلوم کرنا ہے، ادھر عدالت سے جا کر پوچھنا۔ وہاں تھانے میں کوئی سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہا تھا۔“

”ہوں.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

فریدہ نے کہا۔ ”میں اس وقت باورچی خانے میں تھی جب پولیس نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ناصر اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ وہ صبح کلینک سے واپس آ کر خوب ڈٹ کر ناشتا کرتا ہے پھر لمبی تان کر سوجاتا ہے۔ اپنے کلینک میں بھی رات کے آخری پہر سونے کا تھوڑا بہت موقع تو مل جاتا ہے لیکن اس وقفے میں پرسکون اور بے فکری کی نیند سونا ممکن نہیں ہوتا۔ بہر حال.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”میں نے دستک کی تیز آواز سن کر جیسے ہی دروازہ کھولا، دو تین پولیس والوں کو اپنے سامنے پایا۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا، کیا ناصر اس وقت گھر میں ہے؟ میں نے بتایا، ہاں وہ سویا ہوا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ وہ تینوں بھڑامار کر گھر کے اندر داخل ہوئے اور آنا فانا میں میرے بیٹے کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے تو مجھے یہ بتانا بھی گوارا نہیں کیا کہ آخر کس جرم کی پاداش میں وہ ناصر کو گرفتار کر رہے ہیں؟“

وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی، زخمی نظروں سے اپنے شوہر کی جانب دیکھا اور بولی۔
”میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔ پولیس کے جانے کے بعد میں نے ناصر کے ابا کو فیکٹری فون کیا۔ یہ آئے، تھانے گئے اور واپس آ کر بتایا کہ ناصر کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے.....“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ لوگوں کو اس معاملے کے بارے میں اور جو کچھ معلوم ہے وہ بھی بتائیں۔ ویسے میں کل کسی وقت تھانے جا کر ناصر محمود سے بھی ملاقات کروں گا۔ ہو سکتا ہے، کوئی اہم نکتہ ہاتھ لگ جائے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔

”ناصر کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟“

نصیر شاہ نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتایا پھر دیگر سوالات کے جوابات کے سلسلے میں بولا۔ ”ہمیں جو کچھ پتا تھا وہ آپ کو پوری تفصیل سے بتا دیا ہے۔ آپ ناصر سے ضرور ملاقات کریں اور..... جتنی جلدی ممکن ہو سکے، اسے اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ میں آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات اٹھانے کو تیار ہوں۔“

”میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات تو اپنی جگہ حقیقت ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ آپ کا بیٹا اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ وہ لوگ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد اسے اور اس کیس کے چالان کو عدالت میں پیش کریں گے۔ اس کے بعد ہی کوئی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔“

”وکیل صاحب!“ فریدہ نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”جب پولیس والے میرے بیٹے کو عدالت میں لے کر آئیں گے تو آپ اسی روز ناصر کو رہا کر والیں گے نا؟“ اس کی سادگی بلکہ معصومیت پر مجھے ترس آیا۔ یہ ترس منفی تاثر کا نہیں تھا۔ وہ بے چاری عدالتی جھیلوں اور قانونی مویشی گافیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ ایک مکمل گھریلو عورت تھی اور اس سلسلے میں اس کی معلومات لگ بھگ صفر کے برابر تھیں۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے، عدالتی معاملات سے آپ کا زندگی میں پہلی مرتبہ واسطہ پڑا ہے!“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ بیک زبان ہو کر بولے۔ ”اس نوعیت کی افتادہم پر پہلی بار ہی ٹوٹی ہے۔“

میں نے ہر ممکن تسلی بخشی کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تجربہ آپ کے لیے کٹھن اور تلخ ضرور ہو گا لیکن آپ حوصلہ رکھیں۔ آپ بالکل صحیح جگہ پر آئے ہیں۔ میں اپنی بہترین

صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آپ کے بیٹے کو جلد از جلد اس وبال سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ وکیل صاحب!“ انہوں نے یکے بعد دیگرے ممنونیت

بھرے انداز میں کہا۔ ”ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے۔“

”آپ اس احسان کو صرف یاد رکھنے ہی کی بات نہ کریں۔“ میں نے اپنے لہجے میں

ڈرامائی عنصر شامل کرتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ اس کے بدلے میں مجھ پر احسان کرنا نہ بھولیے گا!“

”میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا ہوں وکیل صاحب!“ نصیر شاہ نے الجھن زدہ نظروں

سے مجھے دیکھا۔ ”ہمیں آپ کا یہ احسان کس طرح اتارنا ہوگا..... مطلب یہ کہ آپ پر جوابی احسا

کیسے کرنا ہوگا؟“

”ایسے کہ.....“ میں نے اپنے بیان میں ڈرامائی عنصر کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”ا

کیس کے دوران میں، کسی بھی مرحلے پر اگر آپ کو کوئی اہم یا غیر اہم بات اچانک یاد آ جائے

آپ فوراً مجھ سے اس کا ذکر کریں گے۔“

”ضرور..... ضرور!“ وہ ایک مرتبہ پھر بہ یک زبان ہو کر بولے پھر اطمینان بھری نظروں

سے مجھے دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے انہیں اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔

اگلے روز شام میں مجھے زرا فرصت تھی لہذا میں دفتر سے فارغ ہونے کے بعد اس تھا۔

کی طرف چلا گیا جہاں اس کیس کے ملزم ناصر محمود کو عدالتی ریمانڈ پر رکھا گیا تھا۔ جب کوئی ملز

عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہوتا ہے تو اس سے ملاقات کرنا آسان کام ثابت نہیں ہوتا لیکر

میں اس مشکل کام کو آسان بنانے کے ایک سوا ایک ہتھکنڈوں سے واقف ہوں اور گا ہے بگا۔

اپنی مختلف کہانیوں میں ان ہتھکنڈوں کا ذکر بھی کرتا رہتا ہوں۔

متعلقہ تھانے کا انچارج اس وقت موجود نہیں تھا۔ ڈیوٹی پر حاضر ایک سب انسپکٹر کو یہ

نے مختلف ”فارمولوں“ کی مدد سے ”رام“ کیا اور اپنے ہونے والے موکل ناصر محمود تک رسا

حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ اس وقت حوالات کی کونٹری میں فرش پر چپ چاپ بیٹھا ایک دیوار کو گھور رہا تھا۔

گزشتہ تین روز سے پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔ ظاہر ہے، اس عرصے کے دوران پولیس والوں۔

اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہوگا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا لیکن اس کی محویت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اس کے ”طرز عمل“ سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ وہاں میری موجودگی کو محسوس نہیں کر سکا۔ وہ ایک ٹک کوٹھری کی دیوار کو نکلے جا رہا تھا۔

میں نے کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ تین چار مرتبہ ایسی کوشش کرنے کے بعد مجھے کامیابی ہوئی اور اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر دیرانی اور مایوسی نے بڑا کامل قبضہ جمار کھا تھا۔ اپنے سامنے ایک سوئڈ بوئڈ شخص کو کھڑے دیکھ کر اس کی پیشانی پر حیرت آمیز الجھن کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ اسی لمحے میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”جوان! کیا تم بہت پریشان ہو؟“

میرے استفسار میں ہمدردی اور محبت بھری ہوئی تھی۔ اس نے تھانے کی حدود میں کڑکتے، برستے غصہ ور پولیس والوں کو دیکھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اسی فضا میں کوئی ایسے اپنایت بھرے دوستانہ انداز میں بھی اسے مخاطب کر سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر بے یقینی چمک رہی تھی۔ آتش بار ماحول میں اگر اچانک رم جھم ہونے لگے تو یقین کرنے کو دل نہیں مانتا۔ ان لمحات میں ناصر محمود بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا!

ناصر کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کے باپ کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ چند سال پہلے اس نے انٹر کیا تھا۔ مجھے حوالات کی آہنی سلاخوں کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ بھی کوٹھری کے فرش سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ درمیانے قد اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ سر کے بال سیاہ اور گھونگر یا لے، آنکھیں چھوٹی اور رنگت گندمی۔ اس کی شخصیت اور چہرے کی بناوٹ دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی ابھرتا تھا کہ وہ ایک بے ضرر انسان ہے۔

میرے استفسار کے جواب میں چند لمحات تک تو وہ گم صم کھڑا مجھے دیکھتا رہا، پھر اس کے لبوں میں تھر تھراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”آپ کون ہیں..... اور آپ کو میری پریشانی سے کیا مطلب ہے؟“

”میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔“ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میرا تہمازی پریشانی سے بڑا گہرا تعلق ہے کیونکہ میں اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے مقرر کیا گیا

ہوں۔ نصیر شاہ نے مجھے تمہارا وکیل کیا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور سانس خارج کرنے والے انداز میں اس نے ہونٹوں سے صرف اتنا برآمد ہوا ”اوہ.....!“

میں نے سب سے پہلے نہایت ہی اہم امور کو نمٹانا ضروری سمجھا۔ وکالت نامہ اور دیگر قانونی کاغذات میں اپنے ساتھ لے کر تھانے پہنچا تھا۔ میں نے اپنے مذکورہ کاغذات پر جہاں جہاں ملزم کے دستخط کی ضرورت تھی، وہ کروائے۔ اس کے ہاتھ میں جب قلم چل رہا تھا تو میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ ملزم ناصر محمود لیفٹ پینڈ تھا!

میں نے متذکرہ بالا تمام کاغذات کو سمیٹ کر اپنے بریف کیس میں رکھا اور نہایت ہی متدل انداز میں اس سے محو گفتگو ہو گیا۔ آئندہ پندرہ بیس منٹ میں اس نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں۔

ان میں زیادہ تر وہی باتیں تھیں جو اب تک میرے علم میں آ چکی تھیں۔ چند نئی اور قابل غور باتیں بھی تھیں۔ میں سردست ان اہم امور کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کو خود بہ خود آگاہی حاصل ہو جائے گی۔

میں اس سے ہونے والی اس ملاقات کے اختتام پر جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ مایوسی اور ناامیدی نے ناصر محمود کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اب وہ ایک پُر عزم اور حوصلہ مند نوجوان نظر آ رہا تھا۔



ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت دائر کر دی۔ استغاثہ کی جانب سے جو سرکاری وکیل اس کیس کی پیروی کر رہا تھا، اسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میری نظر میں بلکہ اکثر وکلا کا خیال تھا کہ صولت رضوی کی پیشہ ورانہ شہرت اچھی نہیں۔ یہ صولت رضوی ہی اس کیس میں وکیل استغاثہ کا کردار ادا کر رہا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قتل کے کیس میں، ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی بلکہ اسے

ناممکن کی حد تک مشکل تصور کیا جاتا ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ پولیس کے ہاتھ اتنے کمزور ہوں کہ ابتدائی پیشی پر ہی ملزم پر سے اس کی گرفت ختم ہو جائے۔ جن دنوں ملزم عدالتی ریمانڈ پران کے قبضے میں ہوتا ہے، وہ اس کے خلاف ایک گٹھڑا کیس بنانے کی کوشش میں رہتے ہیں اور جب وہ عدالت میں چالان پیش کرتے ہیں تو اس چالان پر وہ خاصاً فخر محسوس کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ یہی چالان اور استغاثہ انہیں کیس کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

جج کی آمد پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے ملزم کی بے گناہی کے حق میں دلائل دیتے ہوئے ضمانت کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔

وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت کو انتہائی خطرناک قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف دلائل کا پنڈورا باکس کھول دیا۔

اس دوران میں، ہمارے درمیان نوک جھوک اور خوب بحث بھی ہوئی۔ اس گرم گرم ڈبیٹ کے نتیجے میں جج نے ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے احکامات صادر کر دیے۔ قصہ مختصر، میں اپنے موکل کی ضمانت کروانے میں ناکامیاب رہا تھا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔ نصیر شاہ اور اس کی بیوی فریدہ اگرچہ اس روز کی کارروائی سے زیادہ خوش نہیں تھے لیکن میں نے قانونی معاملات کی روشنی میں انہیں تشفی دلا سادے کر رخصت کر دیا۔

آئندہ پیشی پندرہ دن بعد تھی۔ یہ دو ہفتے کا وقفہ یا مدت میرے لیے بہت کافی تھی۔ اس دوران میں، میں بھرپور تیاری کر سکتا تھا۔ استغاثہ کی ایک نقل میں نے حاصل کر لی تھی لہذا میں بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا کہ استغاثہ کی ”فیلڈ“ میں کہاں کہاں گپ واقع ہے اور مجھے کس کس زاویے پر اسٹروک کھیلنا ہے۔

استغاثہ کے مکمل مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو میری ہدایات پر ہوم ورک کر کے مجھے چند مفید معلومات فراہم کر سکے۔ بنیادی طور پر یہ کیس زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا۔ اس کے کردار محدود تھے۔ ایک ڈاکٹر قتل ہو چکا تھا۔ اس کے قتل کے الزام میں ایک ڈپنسر جیل کی ہوا کھا رہا تھا۔ باقی بچا ڈاکٹر یا اور عباس اور دن والا ڈپنسر آصف علی۔ آصف چونکہ میرے موکل کا ہم پیشہ اور ہم رتبہ تھا لہذا میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اسے استعمال کر

سکتا تھا۔ اس سے زیادہ بہتر آدمی اور کوئی ثابت نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے سلسلے میں ایک ٹیکنیکل قباحت تھی جس کی بنا پر میں اسے بچ نہیں کر سکتا تھا۔

اور..... وہ قباحت یہ تھی کہ آصف علی کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اس صورت حال میں، میں اس سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا۔ یقیناً اس سلسلے میں وکیل استغاثہ نے اسے خصوصی ہدایات کر رکھی ہوں گی۔

میں نے اگلے روز ناصر کے باپ نصیر شاہ کو اپنے دفتر میں بلایا اور اس سے کہا۔ ”مجھے ایک ایسے بندے کی ضرورت ہے جو ناصر محمود اور کشور کلینک کے اندرونی اور بیرونی معاملات سے مکمل آگاہی رکھتا ہو۔ میں اس کے ذریعے چند اہم باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے چند لمحات سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”ناصر کا ایک بہت ہی قریبی دوست ہے۔ اس کا نام حامد نواز ہے۔ وہ یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ وہ پہلے اس کلینک پر کام بھی کر چکا ہے۔“

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا حامد نواز بھی پیشے کے اعتبار سے ایک ڈپنر ہی ہے؟“

”جی ہاں.....!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”دن والے کمپاؤنڈر آصف سے پہلے حامد ہی کشور کلینک پر کام کرتا تھا۔ لگ بھگ ایک سال پہلے ہی اس نے یہاں سے کام چھوڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے پرسوج انداز میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، یہ حامد نواز واقعی کام کا بندہ ثابت ہو سکتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

”حامد نواز نے کشور کلینک سے کام کیوں چھوڑا تھا؟“

وہ بتانے لگا۔ ”بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب کہ حامد کی رہائش کورنگی ساڑھے تین پر ہے۔ گلشن والا کشور کلینک اسے گھر سے بہت دور پڑتا تھا۔ وہ گھر کے قریب ہی کام کی تلاش میں تھا۔ ایک سال پہلے اس کی تلاش کامیاب ہو گئی، ایک چھوڑا سے دو دو نوکریاں حاصل ہو گئیں۔ صبح کے وقت کورنگی ہی میں واقع ایک اسپتال میں اسے جاب مل گئی لہذا اس نے گلشن والے کلینک کو خیر باد

کہہ دیا اور ڈاکٹر عمر حیات ویاور عباس نے اس کی جگہ آصف علی کو رکھ لیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے ناصر نے بتایا کہ حامد کو شام میں، کورنگی ہی کے ایک ڈاکٹر کے کلینک میں پارٹ ٹائم جاب مل گئی تھی۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ اس کا روزگار گھر کے نزدیک ہی لگ گیا۔

”میں نے نصیر شاہ کی زبانی یہ تفصیل پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”کیا آپ حامد کو میرے پاس لاسکتے ہیں؟ میں اس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”دو، دو نو کریوں کی وجہ سے اس کے پاس وقت تو بہت کم بچتا ہوگا لیکن میں کوشش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے، وہ آپ سے ملاقات کے لیے تھوڑا بہت وقت ضرور نکال لے گا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ہر سوچ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے ناصر نے بتایا تھا کہ اسپتال سے اسے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملتی ہے اور کلینک بھی اتوار کے روز بند رہتا ہے۔ میرا خیال ہے، ناصر کے لیے وقت نکالنا اس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”دو روز کے بعد اتوار ہے لیکن اتوار کے دن نہ تو عدالت کھلی ہوتی ہے اور نہ ہی میں اپنے آفس آتا ہوں۔ حامد کا کلینک رات میں شروع ہوتا ہے۔ وہ دوپہر کے بعد عدالت میں یا پھر سہ پہر کے وقت میرے دفتر آ کر مجھ سے ملاقات کر سکتا ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے جناب! میں پوری کوشش کروں گا۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں نے نصیر شاہ کو ضروری ہدایات کے ساتھ اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔ وہ پہلے کی بہ نسبت خاصا پرسکون اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔



حامد نواز ایک دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ چہرہ لمبوتر، رنگت سانولی اور بالوں کا اسٹائل ایک معروف فلمی چاکلیٹی ہیرو کے مانند۔ وہ فطری طور پر ایک کم گو شخص تھا۔ اپنی طرف سے اسے کچھ بولنے کی عادت نہیں تھی۔ جتنا پوچھو، اس کا جواب دے دیتا تھا۔ نصیر شاہ کی درخواست پر وہ مجھ سے ملنے آ گیا تھا۔

میں نے اس کی فطرت اور مزاج کے مطابق نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں صورت حال اور اپنی ضرورت سے اسے آگاہ کیا۔ اس نے توجہ سے میری بات سنی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

”وکیل صاحب! میں نے ناصر کے ساتھ اس کلینک میں ایک عرصے تک کام کیا ہے۔ اگرچہ ہماری ڈیوٹی الگ الگ شفٹ میں تھی لیکن ایک آدھ گھنٹا ہمیں ایک ساتھ کام کرنے کا بھی موقع مل جاتا تھا۔ جو کام آپ نے مجھے بتایا ہے، میرا خیال ہے وہ میں آسانی سے کر لوں گا۔ میں نے اس علاقے میں کافی وقت گزارا ہے۔ کلینک کے آس پاس کی دکانوں والے مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ چند ایک سے تو میری دوستی بھی ہے۔ اگر میں اس طرح ناصر محمود کے کام آسکوں تو مجھے خوش ہوگی۔“

حامد نواز نے میرے کئی سوالوں کے جواب میں میری تسلی کرتے ہوئے کہا۔
بہر حال..... حامد نواز کی سنجیدگی اور رویے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میرے کام کا بندہ ہے۔ میں اسے جو بھی مشن دوں گا وہ اس میں سرخ رو ہو کر دکھائے گا۔ میں نے آئندہ آدھے گھنٹے میں اسے مختلف ہدایات دیں اور مطمئن ہونے کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

”ہماری آئندہ ملاقات کب ہو رہی ہے؟“

”میں انشاء اللہ! دو تین دن کے بعد آپ کی طرف چکر لگاؤں گا۔“

”کسی خوش خبری کے ساتھ نا؟“ میں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”بالکل.....!“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”وکیل صاحب! آپ نے جو ذمے داری مجھے

سونپی ہے میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے پاس سہ پہر کا وقت فارغ ہوتا ہے۔ اسی دوران میں کشور کلینک کا چکر لگاؤں گا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے نا، کلینک والے علاقے میں دو چار دکانداروں سے میری اچھی دعا سلام ہے۔ میں انہی لوگوں کو ٹارگٹ بناؤں گا۔ ان کی دکانیں کلینک کے آس پاس ہیں یا پھر بالکل سامنے ہیں۔ کلینک میں داخل ہونے والے ہر بندے پر ان کی نظر رہتی ہے اور میں سمجھتا ہوں، وہ کلینک کے اندر پیش آنے والے اکثر واقعات کی آگاہی بھی رکھتے ہیں۔ آپ کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔“

”کلینک کے اندر پیش آنے والے واقعات کی آگاہی.....!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر عمر حیات کا قتل بھی کلینک کے اندر ہی ہوا ہے..... اس کا مطلب ہے، یہ نکتہ بڑا اہم ہے..... ٹھیک ہے!“ میں نے حامد نواز کی جانب دیکھا اور حتمی لہجے میں کہا۔

”آپ بسم اللہ کر کے اس کام کا آغاز کریں۔ مجھے امید ہے، ہماری آئندہ ملاقات کسی خوشخبری کے ساتھ ہوگی!“

”انشاء اللہ!“ اس نے دثوق بھرے لہجے میں کہا پھر مجھے سلام کر کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

حامد نواز کے جانے کے بعد میں اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ نصیر شاہ کی زبانی جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں۔ ان میں زیادہ دم نہیں تھا۔ البتہ ملزم ناصر محمود نے چند نہایت ہی اہم انکشافات کیے تھے اور اب یہ حامد نواز.....!

میں نے حامد نواز کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ ناصر کا سچا ہمدرد ہے لہذا اس سلسلے میں وہ جو بھی کوشش کرتا، اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس حوالے سے میں بڑا پُر امید تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں بتاتا چلوں۔ اس رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر عمر حیات کی موت چار فردری کی صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ رپورٹ میں یہ واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ جب مقتول کا گلا دبایا گیا تو وہ حالت نیند میں تھا..... گہری نیند میں!

اس گہری نیند کی تشریح بھی کی گئی تھی۔ ڈاکٹر کے معدے سے حاصل ہونے والے شواہد اور مختلف نمونوں کے لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ مقتول ڈاکٹر نے وادی نیند میں قدم رکھنے سے قبل کوئی نشہ آور دوا استعمال کی تھی یا اس کی بے خبری میں اسے ایسی کوئی شے کھلا دی گئی تھی۔

ڈاکٹر عمر حیات کی موت، چونکہ سانس منقطع ہونے کے باعث واقع ہوئی تھی اور شواہد سے پتا چلا تھا کہ گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا لہذا اس کی گردن کا بڑی باریک بینی سے معائنہ کیا گیا تھا۔ اسی معائنے کے دوران میں یہ بات واضح ہو گئی تھی دو مضبوط ہاتھوں نے، حالت نیند میں ڈاکٹر عمر حیات کی گردن دبا کر اس کا قصہ پاک کر دیا تھا۔ گلے کے مختلف حصوں پر انگلیوں

کے مخصوص دباؤ کے آثار ملے تھے۔ اسی ذیل میں ایک چونکا دینے والی اور اہم بات کا بھی انکشاف ہوا تھا اور وہ یہ کہ قاتل نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں انگوٹھیاں وغیرہ پہن رکھی تھیں۔ ان انگوٹھیوں کے زیریں چھلوں کا مخصوص دباؤ چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ انگلیوں کے دباؤ میں اسے نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

اگلی پیشی میں ابھی چند روز باقی تھے۔ تین دن کے بعد حامد نواز عدالت میں آ کر مجھ سے ملا۔ وہ سٹی کورٹ میں پوچھا پوچھتا مجھ تک پہنچ ہی گیا تھا۔ میں اس کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی مفید اور اہم خبر لایا ہے۔ ملاقات پر اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اس نے میری مطلوبہ تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جب وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

”حامد! تم نے ناصر محمود کی خاطر بہت بڑا کام کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم اس کے سچے دوست ہو۔ کیا تم اس کیس کی عدالتی کارروائی دیکھنے آیا کرو گے؟“

”وکیل صاحب! عدالتی کارروائی عموماً دن کے پہلے حصے میں ہوتی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور میں اس وقت اسپتال میں ہوتا ہوں البتہ، اگر کوئی ایسی تاریخ پڑ گئی کہ جس روز اسپتال سے میرا آف ہوا تو میں ضرور عدالت میں آؤں گا۔“

”تم گاہے بہ گاہے مجھ سے رابطے میں رہنا۔“ میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”اس طرح تمہیں مختلف تاریخوں اور عدالتی کارروائیوں کی خبر رہے گی۔ اس دوران میں اگر واقعی کوئی ایسی پیشی پڑ گئی کہ تمہیں آنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی تو اچھی بات ہے۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب!“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”میں آپ سے ٹچ میں رہوں گا۔“

میں نے اسے چند اہم ہدایات دیں اور رخصت کر دیا۔

✱ ✱ ✱

آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے

پہلے مقتول کا بھانجا ڈاکٹر یاور عباس گواہی کے لئے کٹہرے میں آیا۔

ڈاکٹر یاور کی عمر تیس بیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دھان پان اور نرم و نازک شخص تھا۔ رنگت گوری، قد درمیانہ اور چہرہ کلین شیو۔ اس کی شادی ابھی سال، دو سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ خدو خال اور چہرے مہرے جسے وہ ایک شریف النفس اور ہمدرد انسان نظر آتا تھا۔ اس پر اس کا پیشہ بھی ایسا تھا کہ یہ سونے پر سہاگہ والی بات ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر یاور عباس نے روایتی انداز میں ”ایم بی بی ایس“ نہیں کیا تھا بلکہ ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا گیا تھا۔ وہ دی آنا (آسٹریا) سے ”ایم ڈی“ کی ڈگری لے کر واپس آیا تھا اور یہاں کراچی میں اپنے ماموں مقتول ڈاکٹر عمر حیات کے ساتھ مل کر اس نے ”کینسر کلینک“ کھولا تھا۔

اس کے بالعموم مقتول عمر حیات نے اپنے ہی ملک کے ایک میڈیکل کالج سے ”ایم بی بی ایس“ کر رکھا تھا۔ وہ عمر اور تجربے میں اپنے بھانجے سے خاصا سینئر تھا اور صبح کے وقت ایک اسپتال میں بھی جاتا تھا۔ سچ اور حقیقت کیا ہے، اس بحث میں پڑے بغیر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پاکستان میں ”ایم بی بی ایس“ کے سامنے ”ایم ڈی“ (ڈاکٹر آف میڈیسن) کی ڈگری کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

ڈاکٹر یاور عباس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کر دیا۔ وکیل استغاثہ جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لئے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے ڈاکٹر کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کے ماموں جان کی ناگہانی موت کا دلی صدمہ ہے اور میں آپ کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں لیکن یہ عدالتی کارروائی بھی ضروری ہے۔“

”کوئی بات نہیں، آپ اپنا کام شروع کریں۔“ ڈاکٹر یاور نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، بہر حال آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ۔“

صورتِ رضوی نے اپنے تئیں بڑے تعزیتی انداز میں جرح کا آغاز کیا تھا۔ وہ اس عظیم سانحے پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن گواہ نے اس کے ”جذبات“ کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ان لمحات میں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یاور عباس کے نہیں بلکہ صولت رضوی کے ماموں کا قتل

ہوا تھا۔ صولت رنجیدہ اور یاد رکھی حد تک بیزار دکھائی دیتا تھا۔

وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! ملزم رات کی شفٹ میں مقتول کے ساتھ کام کرتا تھا۔ آپ رات گیارہ بجے ان دونوں کو چھوڑ کر کلینک سے چلے جایا کرتے تھے۔ مقتول اکثر و بیشتر، آپ سے بات چیت کے دوران میں، ملزم کی شکایت کرتا رہتا تھا۔ وہ ملزم کی ایک گندی عادت سے بڑا نالاں تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟“

”نہیں، ماموں کو واقعی ایک خاص حوالے سے، ملزم سے شکایت رہتی تھی۔“ یاد و عباس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”اور اسی خاص ”حوالے“ نے وقوعہ کے روز بھی نہایت ہی اہم کردار ادا کیا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے چہیتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”جی..... جی ہاں!“ گواہ نے مختصر سا جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ صولت رضوی کس ”خاص حوالے“ کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ شاید میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں۔ ناصر کی ذات کے تعلق سے کشور کلینک میں ایک تاثر یہ بھی پایا جاتا تھا کہ وہ رقم کی خرد برد میں ملوث پایا گیا تھا۔ رات والے کیش میں عموماً گڑبڑ ہو جایا کرتی تھی اور استغاثہ نے عدالت میں جو چالان پیش کیا تھا اس کے مندرجات میں ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ اس روز سارا کیش ہی غائب ہو گیا تھا۔ استغاثہ کے خیال میں یہ کارنامہ بھی ملزم ہی نے انجام دیا تھا۔

وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کے ماموں کے قتل کے وقت کلینک میں کتنا کیش موجود تھا؟“

”میں بالکل درست فکر تو نہیں بتا سکتا۔“ گواہ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن میرے اندازے کے مطابق کم از کم ساڑھے چار ہزار تو ہوں گے۔“

”کیا یہ صحیح ہے کہ وقوعہ سے چند روز قبل مقتول نے کیش ہی کے سلسلے میں ملزم کو خاصی کھری کھری سنائی تھیں؟“ وکیل استغاثہ نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک خاص زاویے سے کرید جاری رکھی۔

”جی، یہ صحیح ہے!“ یاد و عباس نے اثبات میں گردن ہلایا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ”اور..... مقتول نے ملزم کو یہاں تک وارننگ دے دی تھی کہ اگر آئندہ اس نے ایسی حرکت کی تو اس کی چھٹی کردی جائے گی؟“

”ہاں..... ایسی بات ہوئی تھی۔“

”اور اس واقعے کے چند روز بعد ہی ڈاکٹر عمر حیات کو کلینک کے اندر اس طرح قتل کر دیا گیا کہ سارا کیش بھی غائب تھا.....!“ وکیل استغاثہ نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں..... آپ درست فرما رہے ہیں۔“ یادو عباس نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ صولت رضوی نے معنی خیز نظر سے میری جانب دیکھا اور مزید دو چار سرسری سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔

معزز قارئین! آپ کا ذہن اس بات پر یقیناً الجھ رہا ہو گا کہ یہ اچانک ہی رقم کی خرد برد کا سلسلہ کہاں سے نکل آیا؟ ڈاکٹر عمر حیات کو ناصر محمود سے کیا شکایات پیدا ہو گئیں؟ وہ تو ناصر کی کارکردگی اور ایمان داری سے بہت متاثر تھا پھر اس کی نیت پر یہ کیسا شک؟

آپ کے ذہن میں ابھرنے والے یہ تمام تر سوالات اپنی جگہ درست ہیں۔ یہ اپنی جگہ ہلکا پھلکا وجود تو رکھتے ہیں لیکن حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے..... یعنی میرا موکل نہ تو چور تھا اور نہ ہی رقم کی کسی خرد برد میں ملوث رہا تھا۔ جب یہ ایڈووکیٹ میرے سامنے آیا تو میں نے استغاثہ میں درج اس اہم نکتے کے بارے میں ملزم ناصر محمود سے متعدد سوالات بھی کیے تھے اور اس نے مجھے اطمینان دلادیا تھا کہ اس نوعیت کے کسی جرم میں اس کا ہاتھ نہیں رہا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت تھی کہ رقم میں گڑبڑ تو ہو رہی تھی۔ میں نے ملزم سے پوچھا کہ جب وہ اس معاملے کا ذمہ دار نہیں تو پھر یہ کس کا کارنامہ ہو سکتا ہے؟ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا تھا۔ ”میں نے چونکہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اس لیے دعوے اور وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ مجھے ڈاکٹر عمر حیات پر شک ہے۔ رات بھر کلینک میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں چور نہیں ہوں تو پھر یہ حرکت ڈاکٹر صاحب کی ہی ہو سکتی ہے..... کوئی مریض تو ایسا کرنے سے رہا!“

ڈاکٹر عمر حیات جس فطرت اور طبیعت کا مالک تھا، اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ ایسے لوگ اوجھے ہتھکنڈوں اور کمینی حرکتوں کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مجھے اپنے موکل پر

پورا بھروسہ تھا کہ اس نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی تھی لہذا میرا یہ فرض بنتا تھا کہ اسے اس مصیبت سے باہر نکالوں۔

اپنی باری پر میں ونس باکس کے قریب پہنچا پھر یاد عباس کو اس کے پیشہ ورانہ نمٹل سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کیسے ہیں؟“
”اللہ کا شکر ہے جناب!“ وہ معتدل لہجے میں بولا۔

میں نے اس کی توقع اور عدالت کی روایت کے خلاف سوالات سے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ نے پاکستان کے بجائے وی آنا سے ڈاکٹر بننا کیوں پسند کیا۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”ہاں تھی ایک خاص وجہ.....“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اور اس وجہ کا نام ہے مجبوری!“

”مجبوری..... کیسی مجبوری؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”انٹرسائنس کے بعد میں نے کراچی بلکہ پاکستان کے تمام میڈیکل کالجوں میں ٹرائی کیا لیکن میرے مارکس بہت اچھے نہیں تھے لہذا اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بیرون ملک تعلیم کے بارے میں سوچا جانے لگا۔“ اتنا بتانے کے بعد وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا، گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس مقصد کے حصول کے لیے میرے سامنے تین ممالک تھے۔ آسٹریلیا، آسٹریا اور ترکی۔ میں نے تینوں جگہ قسمت آزمائی اور اسی قسمت کی بدولت میں میلبورن یا استنبول نہ جاسکا۔ میرا مقدر مجھے آسٹریا کے شہر ”وی آنا“ لے گیا جہاں سے میں نے ڈاکٹری پڑھی اور ”ایم ڈی“ کی ڈگری لے کر وطن واپس آ گیا۔“

یاد عباس بہت ہی صاف گو، سادہ مزاج اور اپنے مقتول ماموں کی ضد تھا۔ میں نے جرح کے زاویے کو دوسری جانب گھماتے ہوئے زیر سماعت کیس پر روشنی ڈالنا شروع کر دی۔ میرا یہ انداز وکیل استغاثہ کو بہت برا لگ رہا تھا لیکن مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ دن اور رات کے پہلے حصے میں کلینک پر بیٹھتے تھے۔ کیا آپ

معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ عموماً اس عرصے کے دوران میں آپ کتنے مریض دیکھ لیا کرتے تھے؟“

”میں دو ٹوک تعداد تو نہیں بتا سکتا کیونکہ سنا ہے موت، مریض اور گاہک کا کوئی وقت اور بھروسہ نہیں ہوتا۔“

یادرباس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”ویسے اوسطاً میں چالیس پینتالیس پشٹ دیکھ لیتا ہوں۔“

”چالیس پینتالیس.....!“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”یہ کوئی ”حوصلہ افزا“ تعداد نہیں۔ اس سے دو باتوں کا پتا چلتا ہے۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”نمبر ایک، جس علاقے میں آپ کا کلینک ہے وہاں کے لوگوں کو عموماً ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نمبر دو، اگر پہلی بات درست نہیں تو پھر یہ کہنا چاہیے کہ آپ کا کلینک زیادہ چل نہیں رہا۔ اتنے وقت میں تو دوسرے ڈاکٹر سو، سو اسویا ڈیڑھ سو مریضوں کو بھگتا دیا کرتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی بیان کردہ دوسری وجہ ہی صحیح ہے یعنی..... ہمارا کلینک اس بھر پور انداز میں نہیں چل رہا جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، آپ ایک ہمدرد اور نیک نیت انسان ہیں۔ خواہ مخواہ مریضوں کو الٹے سیدھے چکروں میں نہیں ڈالتے۔ نہ تو غیر ضروری ٹیسٹ وغیرہ لکھ کر دیتے ہیں اور نہ ہی باہر سے دوا لینے پر زور دیتے ہیں۔ آپ مستحق اور نادار مریضوں کو مفت دوا بھی دے دیتے ہیں اور کم آمدنی والے افراد کو بیس تیس میں دوا دے کر ان کی دعائیں لیتے ہیں۔“

میں یہ تمہید ایک خاص مقصد کی خاطر باندھ رہا تھا۔ ذہین قارئین یقیناً میرے مقصد تک رسائی حاصل کر چکے ہوں گے۔

ڈاکٹر یادرباس نے میری وضاحتی تعریف کے جواب میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں

کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”خدمتِ خلق کے اس جذبے کے ساتھ کلینک کرتے ہوئے آپ کی آمدنی میں وہ خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو پارہا ہوگا جو کہ عموماً دیکھنے میں آتا ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ کی روزانہ اوسط آمدنی کتنی ہو جاتی ہوگی..... میں صرف آپ کی شفٹ کی بات کر رہا ہوں؟“

”آئیجیکشن یور آنرا“ وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند اپنی موجودگی کا پہلی مرتبہ احساس دلایا۔ ”اس عدالت میں ڈاکٹر عمر حیات مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ یہ کوئی انکم ٹیکس کا معاملہ نہیں ہے۔ میرے فاضل دوست بتائیں، کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ وکیل صفائی کو ایسی حرکتوں سے فوراً روکا جائے تاکہ عدالت کے قیمتی وقت کا زیاں نہ ہو!“

جج نے میری طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”بیک صاحب! آپ کی موجودہ جرح کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق بنتا ہے؟“

”بہت گہرا تعلق بنتا ہے یور آنرا“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
صولت رضوی پھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جناب عالی! وکیل صفائی سے پوچھا جائے کہ ڈاکٹر عمر حیات کے قتل کا ڈاکٹریا اور عباس کی روزانہ آمدنی سے کیا تعلق بنتا ہے؟“
جج نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”بیک صاحب! آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”جناب عالی! جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، میری اس جرح کا زیر سماعت کیس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ میں اب بھی اپنے موقف پر قائم ہوں لیکن سر دست میں یہ تعلق بہ یک جنبش زباں بیان نہیں کر سکتا۔ اس سے بہت ساری پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے لیکن میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ عدالتی کارروائی جیسے جیسے آگے بڑھے گی، صورت حال واضح ہوتی جائے گی۔“

”بڑا خوب صورت بہانہ ہے.....!“ صولت رضوی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”یہ بہانہ نہیں بلکہ مصلحت ہے میرے فاضل دوست!“

وہ مجھے معاندانہ نظروں سے گھورنے لگا۔

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! ایک اصلاً نسلاً آم کو کھانے کے بعد جب یہ تبصرہ کیا جائے کہ..... ”یہ بہت ہی خوش ذائقہ اور میٹھا آم ہے!“ تو بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”اس آم کے خوش ذائقہ اور شیریں“ ہونے کی کیا وجوہات ہیں.....!“ میں نے لمحاتی توقف کیا، حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، وکیل استغاثہ کو طنزیہ نظر سے دیکھا، ایک گہری سانس خارج کی اور دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جناب عالی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ عدالت کا کمرہ ہے اور یہاں قتل کے ایک کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ یہ ”آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام“ والا کھیل نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہہ کر جان چھڑائی جاسکتی ہے کہ..... آم کھائیں، پیڑ نہ گئیں۔“ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”رضوی صاحب! آم تو کھائے جائیں گے۔ اس کی کوئی ممانعت نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ خوش ذائقہ آم کس پیڑ کی فصل ہے؟ کیا اس پیڑ پر آنے والے تمام آم ایسے ہی شیریں اور خوش ذائقہ ہیں؟ وہ پیڑ کس باغ میں واقع ہے؟ مالی کون ہے؟ وہ کس انداز میں باغ کی دیکھ بھال کرتا ہے؟ پیڑ کی عمر کیا ہے؟ اس کے تنے کی صحت کیسی ہے؟ اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہ کس نسل کے بیج سے وجود میں آیا ہے؟“ میں نے روئے سخن وٹنس باکس میں کھڑے ڈاکٹر یادور عباس کی طرف موڑا اور استفسار یہ انداز میں کیا۔

”ڈاکٹر صاحب! جب کوئی مریض آپ کے پاس آ کر یہ کہتا ہے کہ وہ پچھلے دو ماہ سے بیمار ہے۔ مختلف قسم کے علاج کر لیے لیکن خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا تو آپ تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی بھرپور توجہ اس مریض پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے نا؟“

”جی..... بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔“ یادور عباس نے تصدیق کر دی۔

میں نے کہا۔ ”پھر آپ روٹین سے ہٹ کر مریض کا ٹرائل کرتے ہیں اور اس کی بیماری کی وجوہات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں؟“

ڈاکٹر یاور نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا ”اس قسم کی صورت حال میں ہمیں مریض کا بلڈ اور یورین ٹیسٹ کروانا پڑتا ہے۔ ضرورت پڑے تو ایکس رے وغیرہ بھی لکھ کر دیتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ روٹ کا ز..... مرض کی جڑ تک پہنچا جائے!“

”میں بھی تو یہی کوشش کر رہا ہوں جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر یاور سے ان کی روزانہ آمدنی پوچھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں کوئی انکم ٹیکس آفیسر ہوں۔ دراصل، میرے یہ تمام تر استفسارات کڑی درکڑی آپس میں مربوط ہیں اور اس کیس کی جڑ..... یعنی روٹ کا زینک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ ویسے اگر.....“ میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی، گردن گھما کر استغاثہ کے گواہ ڈاکٹر یاور عباس کی طرف دیکھا اور سرسری انداز میں کہا۔

”..... اگر ڈاکٹر صاحب کو میرے ان سوالات پر اعتراض ہو تو میں موضوع استفسار کو تبدیل کرنے کے لئے تیار ہوں!“

جج نے سوالیہ نظر سے استغاثہ کے گواہ کو دیکھا۔ ڈاکٹر یاور عباس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”مجھے اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”بیگ صاحب! پلیز پروسید!“ جج نے حتیٰ لچھے میں کہا۔

میں نے فاتحانہ انداز میں صولت رضوی کو دیکھا پھر استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ جرح کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا، میں نے اسے وہیں سے جوڑتے ہوئے ڈاکٹر یاور عباس سے پوچھا۔

”جی ڈاکٹر صاحب! آپ کی روزانہ اوسط آمدنی کتنی ہے؟“

”لگ بھگ دو ہزار روپے.....!“ اس نے جواب دیا۔

”اور رات والی شفٹ میں مقتول کتنا کمالیتا تھا؟“ اب میں نے اپنے سوالات میں ایک خاص نوعیت کی کرید بھی شامل کر لی تھی۔

”یہی کوئی..... دو ڈھائی ہزار.....!“ اس نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔

”آپ دن میں دو مرتبہ کلینک پر بیٹھتے ہیں اور آپ کی بیٹھک کا مجموعی وقت آٹھ گھنٹے بنتا ہے جس میں آپ کی آمدنی کم و بیش دو ہزار روپے رہتی ہے۔“ میں نے اپنے جال کو رفتہ رفتہ

سمیٹے ہوئے کہا۔ ”جب کہ مقتول بھی کم و بیش اتنے گھٹنے ہی کلینک کو دیتا تھا..... یعنی رات گیارہ بجے سے صبح سات بجے تک اور اس کی آمدنی آپ سے کچھ زیادہ ہی ہوتی تھی۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول رات میں لگ بھاگ ساٹھ مریض بھگتا دیتا ہوگا؟“

”نہیں جناب..... ایسی کوئی بات نہیں!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیسی بات ہے ڈاکٹر صاحب!“

”رات گیارہ بجے سے صبح سات بجے تک مریضوں کا تناسب بہت کم رہتا تھا اور ان کی تعداد کو نہ ہونے کے برابر کہا جاسکتا ہے۔“ گواہ نے میرے سوال کے جواب میں وضاحت کی۔

”یہی کوئی..... چار سے پانچ مریض!“

”اوہ.....!“ میں نے حیرت بھرے انداز میں سانس خارج کی اور خود کلامی کے سے لہجے میں کہا۔ ”چار سے پانچ مریض اور..... ڈھائی ہزار روپے..... گویا بی مریض اوسطاً پانچ سو روپے چار جنگ؟“ میں خود کلامی کو چھوڑ کر دوبارہ گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس سے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب! کیا رات کے وقت آپ کے کلینک پر گولیاں، کپسول اور انجکشن وغیرہ کوئی خاص قسم کے استعمال ہوتے ہیں یا وہی دن والی ڈسپنری ہی استعمال کی جاتی ہے؟“

”ڈسپنری تو ایک ہی ہے جناب!“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”اور رات میں بھی

مریضوں کو وہی دوائیں دی جاتی ہیں جو میں دن میں دیتا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے، رات میں کسی مصیبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو لوگ آپ کے کلینک میں آتے ہیں انہیں آپ مریض نہیں بلکہ ایک مرغا تصور کرتے ہیں اور انہیں اتانڈ کرنے میں آپ ایک لمحے کی تاخیر مناسب نہیں سمجھتے.....!“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اُ! مولیٰ طور پر مجھے یہ سوال تو رات کی شفٹ والے ڈاکٹر عمر حیات سے پوچھنا چاہیے مگر ان سے کوئی سوال کرنے کے لیے ان کے پاس ہی جانا پڑے گا۔ اگر میں نے جان پر کھیل کر ایسی ہمت کا ارادہ کر بھی لیا تو زیرِ سماعت کیس لنک جائے گا..... اس کیس کے لنکے کا مطلب ہے، میرا موکل، اس ملک، اس شہر کا ایک امن پسند اور شریف النفس شہری بھی ”لنک“ جائے گا۔ لہذا.....

میں یہ سوال آپ سے ہی پوچھنے پر مجبور ہوں ڈاکٹر صاحب!“

ڈاکٹر یاور عباس نے کھکار کر گلا صاف کیا اور کہنے لگا۔ ”ذکیل صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ مریض، مریض ہی ہوتا ہے۔ اسے مرغا کہنا یا سمجھنا مناسب بات نہیں..... البتہ، جہاں تک زیادہ چار جنگ کا تعلق ہے تو میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ ماموں کچھ زیادہ ہی چارج کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں، میری کئی مرتبہ ان سے بات بھی ہوئی تھی.....!“

اس نے بڑی صفائی سے اپنے مقتول ماموں کو کور دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس کی وضع داری اور دور اندیشی بھی تھی لیکن میں اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے قدم، قدم اپنی منزل کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے مقتول سے یقیناً بات کی ہوگی لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ آپ کا ماموں اپنی روش تبدیل کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟“

”آپ بڑی حد تک صحیح کہہ رہے ہیں۔“ اس نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔
میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ ”اکثر مریض جو رات میں مقتول کو دکھا کر گئے ہوتے تھے جب وہ دن میں آپ کے پاس آتے تو وہ چار جنگ کے معاملے میں مقتول کی شکایت بھی کرتے تھے۔ بعض دے الفاظ میں اور بعض کھلم کھلا ناراضی کا اظہار کرتے تھے لیکن.....“ میں نے وانستہ جملہ ادھورا چھوڑا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ اپنی والدہ کی وجہ سے مجبور تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ ناہید صاحبہ اپنے بھائی یعنی آپ کے ماموں کی..... جا اور بے جادو نوں نوعیت کی حمایت کرتی ہیں اور آپ اپنی والدہ کی بہت مانتے ہیں لہذا..... مقتول کے سلسلے میں آپ کو بہت سے تلخ اور کڑوے گھونٹ بھی حلق سے اتارنا پڑتے تھے اور.....!“

”پلیز.....!“ ڈاکٹر یاور عباس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا..... آپ اور کوئی سوال کریں۔“
”اٹس اوکے!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ پچیس مارچ کو رات یعنی دو بجے سے لگ بھگ دس دن پہلے آپ کے کلینک پر ایک مریض لایا گیا تھا۔ مقتول کی ”تشخیص“ کے مطابق اس مریض کو

گردے کا درد تھا۔ اگر مجھے حاصل ہونے والے حقائق میں کوئی گڑبڑ نہیں تو مذکورہ مریض کا نام فیروز خان تھا جو نیپا چورنگی کے آس پاس کہیں رہتا تھا؟“

”جی ہاں..... وہ مریض میرے ذہن میں ہے۔“ ڈاکٹر یاد نے جواب دیا۔ ”وہ اپنی بیوی کے ساتھ کوئی رات دو بجے ہمارے کلینک پر لایا گیا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو گردے کے درد سے تڑپ رہا تھا۔ دو گھنٹے کے بعد وہ اپنے قدموں پر چل کر گھر گیا تھا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا اور پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ اگرچہ رات والی شفٹ کا کیس تھا لیکن اگلے روز مجھے اس کی تفصیل مل گئی تھی۔“

”اگر وہ کیس اور مریض فیروز خان آپ کے ذہن میں محفوظ ہے تو پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اس رات آپ کے مقتول ماموں جان نے ان بے بس لوگوں کے ساتھ کیا ”سلوک“ کیا تھا؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ خاصا کڑوا ہو گیا۔

”کیا سلوک کیا تھا.....؟“ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ انجان بن گیا۔

میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر یاد عباس کا یہ رد عمل یا طرز عمل اس کی شرافت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ اپنے ماموں کو دل سے پسند نہیں کرتا تھا، اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کا بھی خواہاں نہیں تھا لیکن اپنی والدہ کی وجہ سے مجبور تھا اور اب میں ڈاکٹر عمر حیات کو مقتول کو کھولنے کی مہم پر کمر بستہ دکھائی دیتا تھا۔ میں اگرچہ اس کے دل کی باتیں کر رہا تھا لیکن وہ اپنی وضع داری کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری تائید کرنے کے بجائے انجان بن رہا تھا۔ میں نے حامد نواز کی محنت کے پھل کا استعمال جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! فیروز خان کی بیوی زری گل اس رات دو بجے کے قریب اپنے شوہر کو لے کر آپ کے کلینک پر پہنچی۔ فیروز خان اپنے پیٹ کے زیریں حصے میں تکلیف کی شکایت کر رہا تھا۔ یہ درد اتنا شدید تھا کہ زری گل کورات گئے اسے لے کر آپ کے کلینک تک آنا پڑا۔ مقتول نے مریض کا معائنہ کیا اور فتویٰ دے دیا کہ یہ سراسر گردے کا معاملہ ہے۔ مریض کے ایک گردے میں پتھری کی نشاندہی بھی کی گئی۔ یہ وہی گردہ تھا جس طرف فیروز خان دردمسوس کر رہا تھا اور ”نشاندہی“ کے لیے الٹراساؤنڈ کیا گیا تھا اور اس دوران میں مریض تکلیف سے تڑپتا رہا تھا۔ بہر حال، اس درد ناک تشخیص کے بعد فیروز خان کو ڈرپ لگا دی گئی جس میں پیلے، سفید اور گلابی انجکشن بھی ڈالے

گئے۔“ میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں اگر چہ ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بالفرض، فیروز خان درگرددہ میں مبتلا تھا بھی تو الٹراساؤنڈ، ولٹراساؤنڈ وغیرہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر اس کی نس میں ہائیوسین، بیرل جین یا بسکو پین وغیرہ کا انجکشن بھی چڑھا دیا جاتا تو وہ تکلیف سے نجات حاصل کر سکتا تھا..... یا زیادہ سے زیادہ ڈرپ کے ذریعے انہی میں سے کوئی انجکشن اس کے خون میں پہنچا دیا جاتا۔ میں ایک مرتبہ پھر ”بہر حال“ کہنے پر مجبور ہوں۔“ میں نے ذرا رک کر جج کی جانب دیکھا پھر دوبارہ استغاثہ کے گواہ ڈاکٹر یاد عباس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔

”بہر حال..... آپ کے ماموں نے مریض کی تکلیف دور کرنے کے لیے جو ”جتن“ بھی کیے، مجھے ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، صرف افسوس ہی کر سکتا ہوں البتہ، اس دردناک کہانی کا جو شرم ناک انجام ہوا اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اسی ”سلوک“ کا ذکر کیا تھا ڈاکٹر صاحب!“

”آج بیکشن یور آنرا!“ میرے خاموش ہوتے ہی صولت رضوی نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ”وکیل صفائی نے کافی دیر سے ”سلوک سلوک“ کی رٹ لگا رکھی ہے لیکن ابھی تک انہوں نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ یہ سراسر زیادتی والی بات ہے اور ان قصے کہانیوں سے عدالت کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے.....!“

”میرے فاضل دوست!“ میں نے وکیل استغاثہ کی کڑوی کیلی بات کے جواب میں نہایت ہی متحمل لہجے میں کہا۔ ”عدالت کے قیمتی وقت کا مجھے آپ سے زیادہ احساس ہے!“

”اگر آپ کو عدالت کے وقت کا اتنا ہی احساس ہے تو جلدی سے ”سلوک“ والے راز سے پردہ اٹھا دیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”میں بھی تو دیکھوں، آپ کون سا سانپ نکالنے والے ہیں!“

”میں نہ تو کوئی توپ چلانے والا ہوں اور نہ ہی کوئی سانپ نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں میرے فاضل دوست!“ میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو دردناک کہانی کو سمیٹ کر اس کے ”سلوک“ اختتام کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا کہ آپ نے انتہائی بے صبری کا

مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نعرہ بلند کر دیا..... آنکھیں پور آنر!“

اس دوران میں استغاثہ کا گواہ ڈاکٹر یادرباس چپ چاپ وٹس باکس میں کھڑا ہمارے درمیان ہونے والی نوک جھوک کا تماشا دیکھتا رہا۔ میں نے وکیل استغاثہ پر طنزیہ تیروں کی بارش روکی تو جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالنے کے بعد کہا۔

”بیگ صاحب! یہ عدالت اور حاضرین عدالت آپ کی زبان سے جلد از جلد اس سلوک کا راز جاننا چاہتے ہیں جس کا ذکر خیر یا ذکر شر پچھلے کئی منٹ سے جاری ہے.....!“

”او کے پور آنر!“ میں نے اپنی گردن کو تعظیسی جنبش دیتے ہوئے کہا پھر استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کے بقول، فیروز خان تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے کلینک میں داخل ہوا تھا اور اپنے قدموں پر چلتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوا تھا لیکن آپ نے محسوس کیا کہ واپسی کے سفر میں اس کے دل اور دماغ کی کیا حالت تھی؟ وہ درد گردہ لے کر آپ کے کلینک پر آیا تھا۔ آپ کے ماموں جان نے اس کی تکلیف تو وقتی طور پر آنکھشن کے ذریعے دور کر دی مگر اس کے دل و دماغ میں ایک ایسا الاؤ روشن کر دیا جس کی تپش میں کافی عرصے تک وہ سلگتا اور جھلستا رہا تھا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

ڈاکٹر یادرباس نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آنے والی خفت اور خجالت اس کی ندامت اور شرمندگی کا اعلان کر رہی تھی۔ یہ پراسرار احترازی خاموشی گویا اس امر کا ثبوت تھی کہ وہ میری بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا!

جج نے بڑے تشویش ناک لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔ ”وکیل صاحب! کیا مقتول نے خداخواستہ مریض کا کوئی گردہ وغیرہ پار کر دیا تھا؟“

جج جیسی بردبار شخصیت کے منہ سے یہ استفسار مجھے ایک لطیفہ، ایک مذاق ہی محسوس ہوا لیکن اس نے اتنی سنجیدگی سے سوال اٹھایا تھا کہ میں جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جناب عالی! انسان کے پاس سب سے اہم شے اس کی عزت اور عزت نفس ہوتی ہے۔ اگر کوئی کسی کے جسم میں سے گردہ نکال لے یا اس کے بدن کا کوئی حصہ کاٹ کر الگ کر دے تو

اسے اتنی تکلیف اور اذیت نہیں پہنچے گی جتنی کہ وہ اس وقت محسوس کرے گا جب اس کی عزت پر حرف آ رہا ہو۔ بے عزتی کے احساس سے زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ اور کوئی احساس ہو ہی نہیں سکتا۔ اس رات مقتول ڈاکٹر نے فیروز خان کے ساتھ جو حرکت کی اس نے فیروز خان اور زری گل کے جذبات و احساسات کو زبردستی بوجھ کر کیا تھا۔ ان کی عزت اور عزت نفس کا گویا جنازہ نکال دیا گیا تھا۔ یہ حرکت اگر معاشرے کا کوئی اور منہی کردار، غنڈہ ابد معاش کرتا تو اتنی افسوسناک بات نہ ہوتی۔ ایک ڈاکٹر جسے معاشرے میں مسیحا ایسی حیثیت حاصل ہے اسے تو ایسا عمل ہرگز نہیں زیب دیتا۔ ڈاکٹر اور ڈاکو میں کچھ تو امتیاز بہر حال ہونا چاہیے!“

میں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوا تو ج سمیت تمام حاضرین عدالت کی نظریں مجھی پر لگی ہوئی تھیں۔ اس مرتبہ میرے توقف پر کسی نے کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی کوئی سوال اٹھایا۔ حتیٰ کہ وکیل استغاثہ بھی ٹرانس کی سی کیفیت میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سب اس بات کے منتظر تھے کہ میں جلد از جلد اپنے بیان کے کلائم تک پہنچوں۔ میں نے ڈرامائی پھویشن کو برقرار رکھتے ہوئے مزید کہا۔

”یور آنرا فیروز خان نامی گردے کا وہ مریض جب ڈرپ چڑھوانے کے بعد فارغ ہوا تو کلینک چھوڑنے سے پہلے انہیں بل کی ادائیگی کے لیے ایسے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر عمر حیات نے اپنی محنت کا بل آٹھ سو روپے بنا دیا تھا۔ زری گل گھر سے نکلنے وقت صرف چار سو روپے اپنے ساتھ لاسکی تھی۔ تیس روپے ٹیکسی والے نے لے لیے تھے اور واپس بھی انہیں ظاہر ہے، ٹیکسی ہی سے گھر جانا تھا لہذا کھلے پیسوں کو الگ رکھتے ہوئے زری نے مقتول سے کہا کہ وہ تین سو روپے لے لے۔ باقی کی رقم وہ کل کسی وقت آ کر ادا کر دے گی۔ یہ بات نوٹ کی جائے جناب عالی..... کہ زری نے بل کی رقم کم کرانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ ادائیگی کے لئے تھوڑی سی مہلت کی خواست گارتھی لیکن مقتول نے اس کی استدعا کو بیک جنبش رد کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

”بل کی رقم ادا کیے بغیر تو آپ نہیں جاسکتے!“

زری پہلے ہی کم پریشان نہیں تھی۔ اس نئی افتاد نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے نہایت ہی نرمی سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ جو آپ کے برابر میں نادر خان کا ہوٹل ہے نا، یہ ہمارا رشتے دار ہے۔ یوں سمجھیں، فیروز خان، نادر خان کے بہنوئی تقدیر خان کا بہنوئی ہے۔ آپ کو ہمارا کچھ تو خیال کرنا چاہیے!“

”لیکن نادر خان تو گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل بند کر کے گھر چلا جاتا ہے۔“ مقتول ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھا۔ ”وہ جب یہاں موجود نہیں تو اس کی ضمانت کی کیا اہمیت ہے۔ نادر خان تو ادھر کہیں سہراب گوٹھ پر رہتا ہے نا!“

مقتول نے ضمانت کی بات کی تو زری گل نے کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! ہم اس وقت نادر خان کو تو یہاں نہیں لاسکتے لیکن ضمانت دینے کے لیے میرے پاس ایک اور شے ہے!“

”کیا شے؟“ ڈاکٹر نے دلچسپی سے پوچھا۔

زری گل نے اپنے کانوں سے طلائی بالیاں اتاریں اور ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیں۔ مقتول نے ایک لمحہ سوچے بغیر زری گل کا وہ مختصر سا زیور ہاتھ رکھ کر ان میاں بیوی کو جانے کی اجازت دے دی۔ ”میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک افسردہ سانس لی اور وٹنس باکس میں کھڑے ڈاکٹر یاور عباس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”کیوں ڈاکٹر صاحب! ایسا ہوا تھا یا نہیں؟“

”ہوا تھا.....“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس واقعے کا سخت افسوس ہوا تھا اور اگلے روز جب دن میں زری گل اپنے شوہر کو لے کر میرے پاس آئی تو میں نے رات میں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی ہر ممکن تلافی بھی کر دی تھی۔ میں نے سب سے پہلے تو اس کی بالیاں واپس کیں۔ علاوہ ازیں پانچ سو روپے کا حساب بھی ختم کر دیا یعنی رات والے ٹریسٹ کے ذیل میں صرف تین سو روپے ہی وصول کیے اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک ہفتے کی دوا بھی اپنے پاس سے مفت دی تھی۔“

”آپ کا یہ جذبہ ہمدردی قابل ستائش ہے ڈاکٹر صاحب!“ میں نے سراسنے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ زبان اور رویے سے لگنے والے لگھاؤ اس قسم کی لپٹا پوتی سے نہیں بھرا کرتے!“

”میرے بس میں جو تھا، وہ مین نے کیا۔“ یاور عباس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”میں فیروز خان اور زری گل کی اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا تھا۔“

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! پچیس مارچ کی

رات کشور کلینک پر وہ قابل مذمت واقعہ پیش آتا ہے اور ٹھیک دس روز کے بعد اسی کلینک پر مبینہ قصور وار اور ذمے دار رات کی ڈیوٹی والا ڈاکٹر قتل کر دیا جاتا ہے۔ ان واقعات میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی تعلق تو ہوگا..... تعلق ہونا تو چاہیے نا.....!“

”آپ کا مطلب کیا ہے؟“ صولت رضوی کو یاد آ گیا کہ اس نے کافی دیر سے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ”آنجیکشن یور آزر!“ کانفرہ بلند کرنے کے بجائے اس مرتبہ اس نے براہ راست مجھی سے پوچھ لیا۔ ”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر عمر حیات کو فیروز خان نے قتل کیا ہے؟“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی رضوی صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو ایک قوی امکان کی نشاندہی کی ہے، دونوں واقعات میں ایک تعلق اور رابطہ ڈھونڈنے کی بات کی ہے لیکن آپ نے تو بات ہی مکمل کر دی.....!“

”مم..... میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے جس امکانی تعلق کی نشاندہی کی تھی، آپ نے اس کو معافی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ آپ نے اپنے ذہن کے خیال کو مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے عدالت تک پہنچایا ہے..... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر عمر حیات کو فیروز خان نے قتل کیا ہے؟“

”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ وہ شپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو آپ کی بات میں سے ایک نتیجہ اخذ کیا تھا۔ اگر میری نظر میں ڈاکٹر عمر حیات کو فیروز خان نے قتل کیا ہوتا تو اس وقت اکیوزڈ باکس میں آپ کے موکل کے بجائے فیروز خان کھڑا ہوتا.....!“

صولت رضوی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے مجھے ایسا کیا بتا دیا ہے جو میں اس قدر اس کا شکر گزار ہو رہا ہوں۔ ذہ متذبذب اور الجھن زدہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی جج کی جانب دیکھنے لگا۔

اس کی سمجھ میں تو تب آتا اگر میں نے واقعی کوئی اہم بات کی ہوتی۔ میں نے تو اسے چکر دینے کے لیے ایک سنجیدہ مذاق کیا تھا اور وہ واقعی میرے چکر میں آ بھی گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت درخواست کرنے کا حکم جاری کر دیا۔



پچھلی پیشی پر میں گویا ڈاکٹر یا اور عباس سے لپٹ کر رہ گیا تھا اور میں نے مقتول اور اس کے کرتوتوں کو ہی اپنی جرح کا مرکز و محور بنالیا تھا حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سارے گوشے تھے جن سے متعلق وکیل استغاثہ نے سوالات اٹھائے تھے۔ مجھے اس سلسلے میں بھی گواہ سے کاؤنٹر جرح کرنا چاہیے تھی لیکن میں نے انہیں یکسر نظر انداز کر دیا تھا مثلاً.....

صولت رضوی نے انکشاف کیا تھا کہ مقتول، ملزم کی کیش میں ہیرا پھیری سے نالاں تھا اور اسے نوکری سے نکالنے کی دھمکی بھی دے چکا تھا۔ ڈاکٹر یا اور عباس نے اس کی..... کمزور ہی سہی مگر تصدیق کی تھی پھر میرے موکل پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا تھا کہ وہ کلینک کا سارا کیش لے اڑا تھا۔ کیش کے غیاب کی بھی یا اور عباس نے تصدیق کی تھی۔ استغاثہ نے اس مبینہ چوری کو قتل کے ساتھ لنک کیا تھا۔ استغاثہ کے مطابق، مقتول نے چونکہ ملزم کو نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی تھی لہذا اس نے رات کے آخری پہر چائے میں نیند آور گولیاں ملا کر پلا دیں اور پھر صبح حالت نیند میں اسے قتل کیا اور کیش لے کر کلینک سے نکل گیا تا کہ یہی نظر آئے کہ کسی شخص نے کیش کی خاطر قتل کی یہ واردات کی ہے۔ الغرض، استغاثہ میں کئی مقامات پر ایسی ایسی خامیاں موجود تھیں کہ وہ چوں چوں کا مربا بن کر رہ گیا تھا لہذا میں نے اس اینگل کو بھی بچ نہیں کیا تھا۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان زاویوں پر تنقید اور لتاؤ کی بہت گنجائش تھی اور میں ایک ہک شیخ مار کر وکیل استغاثہ کو ناک آؤٹ کر سکتا تھا جس سے کیس کا پاساپلٹ جاتا لیکن میں پائپ لائن کے بجائے مین اسٹریم میں رہ کر اپنے موکل کا نہ صرف دفاع کرنا چاہتا تھا بلکہ اسے باعزت بری کروانا چاہتا تھا۔

میں نے کیس کے دیگر ”اعضا“ کو یکسر فراموش کر کے اس کی ”ریڑھ کی ہڈی“ کو نوکس کر لیا تھا۔ میں اس ”درخت“ کی چھوٹی شاخوں کو بھول کر محض تنے پر اپنی جرح کی کہلاڑی برسا رہا تھا اور وہ ریڑھ کی ہڈی یا تانا تھا..... مقتول ڈاکٹر عمر حیات!

میں نے گزشتہ پیشی پر مقتول کے اوصاف خبیثہ اور مزاج کمینہ کو بڑی وضاحت کے

ساتھ عدالت کے سامنے کھول دیا تھا۔ اس طویل ترین جرح کے نتیجے میں اس کیس کا ایک نیا پہلو طلوع ہو کر سامنے آیا تھا کہ..... کہیں ڈاکٹر عمر حیات کو فیروز خان نے تو قتل نہیں کیا؟

یہ وہ سنسنی خیز سوال تھا جو میری جرح کے اختتام پر سامنے آیا تھا اور اس سوال نے وکیل استغاثہ کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ یہ سوال اٹھانے کا میرا مقصد بھی صولت رضوی کو الجھانا ہی تھا اور میں اپنے مقصد میں صد فی صد کامیاب رہا تھا۔

جبکہ حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ ملزم ناصر محمود کی فراہم کردہ معلومات اور اس کے دوست حامد نواز کی کاری محنت کے نتائج میرے ذہن میں محفوظ تھے اور میں انہی کو بر محل استعمال کر کے قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اپنی منزل سے چند قدم کی ہی دوری پر تھا۔

آئندہ پیش پر یکے بعد دیگرے استغاثہ کی طرف سے دو گواہ پیش کیے گئے۔ اکرام اللہ اور عبدالرحمن نامی ان دو گواہوں کا تعلق اسی علاقے سے تھا جہاں کشور کلینک واقع تھا۔ ان گواہوں کے بیانات میں کوئی اہم بات نہیں لہذا میں ان کے ذکر کو گول کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

اگلی گواہی جاوید نامی ایک شخص کی تھی جو پیشے کے اعتبار سے خا کر و ب تھا۔ جاوید، کشور کلینک میں دو مرتبہ صفائی وغیرہ کرنے آتا تھا۔ پہلی مرتبہ صبح میں لگ بھگ دس بجے اور دوسری بار شام میں پانچ بجے کے قریب۔ گویا، دونوں دفعہ اس کا واسطہ صبح اور دن والے ڈسپنسر آصف ہی سے پڑتا تھا کیونکہ ناصر کم و بیش نو بجے کلینک سے نکل جایا کرتا تھا۔

جاوید کی عمر کا درست اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ گھونگر یا لے بالوں اور سیاہ رنگت والے اس سوپر کا قد کاٹھ اور خد و خال ایسے تھے کہ کبھی وہ بیس سال کا لگتا تھا اور کبھی پینتیس سال کا نظر آتا تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ وہ ایک مستند عمر چور ہے۔ اس کے پانچ بچے تھے اور وہ چالیس سال سے متجاوز تھا! جاوید ہی وہ شخص تھا جس نے مقتول کی لاش دریافت کی تھی۔

جاوید نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا بیان ریکارڈ کر دیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو اس نے وقوعہ کے روز پولیس کو دیا تھا۔ وکیل استغاثہ جج کی اجازت لے کر جرح کے لیے گواہ کے کنٹرے کے پاس پہنچ گیا۔

”جاوید!“ اس نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”وقوعہ کے روز تم کتنے بجے کلینک

پہنچے تھے؟“

”میرا خیال ہے اس وقت دس بجے تھے۔“ گواہ نے جواب دیا۔

”کیا تم روزانہ ہی صبح اسی وقت صفائی کرنے آتے ہو؟“

”جی ہاں..... زیادہ سے زیادہ دس منٹ اوپر یا نیچے۔“

”جب دقوعہ کے روز تم کلینک پہنچے تو ملزم وہاں موجود تھا؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

گواہ نے نفی میں جواب دیا۔

”ملزم موجود نہیں تھا تو اس کا مطلب ہے، کلینک بند ہوگا.....!“

میں صولت رضوی کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک خاص پوائنٹ کو سامنے لانے کی کوشش کر رہا تھا، میری نظر میں جس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ جاوید نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

”جناب! کلینک بند نہیں تھا، صرف اس کا باہر والا شٹر گرا ہوا تھا اور یہ روزانہ کا معمول ہے۔ ناصر آٹھ نو بجے چھٹی کر کے گھر چلا جاتا ہے اور کلینک کا شٹر گرا جاتا ہے مگر تالے لگا کر اسے باقاعدہ لاک نہیں کرتا کیونکہ یہ چوبیس گھنٹے کا کلینک ہے۔ آصف بھی میری طرح دس بجے تک کلینک پہنچتا ہے۔ کبھی وہ پہلے آ جاتا ہے اور کبھی میں۔ جب آصف مجھ سے پہلے آ جاتا ہے تو مجھے شٹر اٹھا ہوا ملتا ہے اور اگر میں پہلے آ جاؤں وہ شٹر مجھے اٹھانا ہوتا ہے جیسا کہ دقوعہ کے دن ہوا تھا۔“

گواہ سانس لینے کے لیے تھما تو وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”دقوعہ کے روز تم نے کلینک کا شٹر اٹھایا اور اندر داخل ہو گئے پھر تم نے کیا دیکھا؟“

”میں نے دیکھا.....!“ وہ خوفناک لہجے میں بتانے لگا۔ ”کلینک کے پچھلے حصے میں ایک

کاؤچ پر ڈاکٹر عمر حیات سو رہے تھے۔ یہ وہی کاؤچ تھا جہاں مریضوں کو لٹا کر چیک اپ کیا جاتا ہے اور ڈرپ وغیرہ بھی لگائی جاتی ہیں۔ پچھلی گرمیوں میں مجھے اسہال کی بیماری ہو گئی تھی اور ڈاکٹر یار عباس نے مجھے بھی ڈرپ لگائی تھی.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

”مجھے یہ بات پتا تھا کہ ڈاکٹر عمر صبح سات بجے تک گھر چلے جاتے تھے۔ اس روز پہلی

مرتبہ میں نے انہیں اتنی دیر تک کلینک میں سوئے پڑے دیکھا۔ مجھے صفائی کرنا تھی۔ میں نے انہیں نہیں جگایا اور پنکھا بند کر کے اپنے کام میں لگ گیا۔ میرا خیال تھا، پنکھا بند ہونے کے بعد وہ خود ہی

اٹھ جائیں گے لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے جسم میں ذرا سی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ فطری تجسس مجھے ڈاکٹر کے قریب لے گیا اور میں نے جھک کر ان کا جائزہ لیا۔ اسی وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ سانس بھی نہیں لے رہے۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ زندہ نہیں ہیں.....“

”پھر تم نے کیا کیا؟“ وکیل استغاثہ نے فوراً سوال داغ دیا۔

گواہ نے بتایا۔ ”میں فوری طور پر کلینک سے باہر آیا اور نادر خان کو اس کے بارے میں بتایا۔ نادر خان کا چائے خانہ کلینک کے ساتھ ہی ہے۔ جب میں نادر خان کو ڈاکٹر صاحب کی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا تو اسی وقت آصف بھی کلینک پہنچ گیا۔ وہ بھی اس صورت حال سے گھبرا گیا پھر ہم تینوں کلینک کے اندر آئے، گہری نظر سے ڈاکٹر کا جائزہ لیا اور متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ڈاکٹر عمر حیات اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔“

”ہوں.....!“ وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا اور گواہ سے استفسار کیا

”پھر کیا ہوا؟“

”اس سچویشن نے میرے ساتھ ساتھ آصف اور نادر خان کو بھی تشویش میں ڈال دیا تھا۔“ جاوید نے بتایا۔ ”لیکن آصف کے ذہن نے بروقت کام کیا اور اس نے ڈاکٹر یادر عباس کو فون کر کے اس واقعے بلکہ سامنے کے بارے میں مطلع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کلینک پہنچ گئے پھر انہوں ہی نے پولیس اسٹیشن فون کر کے ڈاکٹر عمر حیات کی موت کی اطلاع دی تھی۔“

”او کے.....!“ وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر مزید دو، تین سوالات پوچھ کر گواہ کو فارغ کر دیا۔

اپنی باری پر میں گواہ کے کٹہرے کے قریب چلا آیا۔ میں نے جرح کا آغاز کرنے سے پہلے بڑی گہری نظر سے جاوید کا تنقیدی جائزہ لیا پھر پوچھا۔

”جاوید! مجھ سے پہلے وکیل استغاثہ نے اس کیس کے حوالے سے تم سے جو سوالات کیے اور تم نے ان کے جو جوابات دیے اس کے علاوہ بھی تمہیں کچھ معلوم ہے؟“

اس نے چند لمحوں تک سوچا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں!“

”تمہیں کشور کلینک پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”پانچ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں“

”ملزم پچھلے چار سال سے اس کلینک میں کمپاؤنڈری کر رہا تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، تم اس سے زیادہ پرانے ہو۔ وہ تمہارے سامنے ہی آیا تھا؟“

”جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”تمہاری، ملزم سے ملاقات اور بات چیت تو رہتی ہوگی؟“

”کچھ زیادہ نہیں!“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ ناصر رات کی ڈیوٹی کرتا تھا اور مین دن کے وقت دو مرتبہ کلینک میں صفائی کرنے آتا تھا لہذا ملاقات کے امکانات کم تھے، البتہ.....“ اس نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

”میں چونکہ ادھر قریب ہی رہتا ہوں اور یہاں کی اکثر دکانوں میں صفائی بھی میں ہی کرتا ہوں تو اس وجہ سے کئی بار یہاں کا چکر لگ جاتا ہے۔ رات میں اگر کسی کام سے اس طرف آنا ہوتا تو میں ڈاکٹر صاحب کو سلام کرنے کلینک آ جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ ہفتے، دس دن میں ملزم سے ایک آدھ ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔“

”یہ بھی بہت ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر وٹنس باکس میں کھڑے گواہ سے پوچھا۔ ”جاوید! تمہاری قوت مشاہدہ کیسی ہے؟“

وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے آسان الفاظ میں اسے ”قوت مشاہدہ“ کا مفہوم سمجھایا تو وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”جناب! میری آنکھیں اور حافظہ بہت تیز ہے۔ ایک بار جس شے کو دیکھ لوں وہ میرے دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔“

”بڑی اچھی بات ہے۔“ میں نے عام سے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”پچھلے چار سال میں تم نے ایک بار نہیں بلکہ کم از کم دو سو مرتبہ ملزم کو دیکھا ہوگا۔ میں ملزم کی شخصیت اور تمہاری یادداشت کے حوالے سے ایک اہم سوال کرنے والا ہوں۔ یہ تمہارے دعوے کا امتحان بھی ہے۔

دیکھتے ہیں تمہاری آنکھیں اور حافظہ کتنا تیز ہے.....؟“

”جی پوچھیں.....!“ وہ کٹہرے میں سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”جاوید! ذرا سوچ کر بتاؤ، کیا ان چار سالوں یا ان دو سو ملاقاتوں کے

دوران میں تم نے کبھی ملزم کو اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں وغیرہ پہنے دیکھا ہے؟“

”نہیں جناب.....!“ گواہ نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ”نہ سیدھے ہاتھ کی

انگلیوں میں اور نہ ہی اٹلے ہاتھ کی انگلیوں میں.....!“

میں نے ایک خاص انداز میں جج کی سمت دیکھا اور اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اور

کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا!



منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں استغاثہ کا گواہ اور کشور کلینک میں دن کی ڈیوٹی کرنے والا ڈسپنسر آصف علی کھڑا تھا۔

آصف پستہ قامت، ایک سانولانا جوان تھا۔ عمر بائیس تیس سال رہی ہوگی۔

آصف نے حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا، وکیل استغاثہ نے چند سوالات کے بعد اسے فارغ

کر دیا تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ وکیل

استغاثہ نے اس سے جو سوال پوچھے تھے، میری نظر میں ان کی زیادہ اہمیت نہیں تھی لہذا میں نے

انہیں دہرانے یا ان پر تنقید کرنا ضروری نہ سمجھا اور اپنے مخصوص انداز میں عدالتی کارروائی کو آگے

بڑھاتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

”آصف علی! کیا یہ سچ ہے کہ تمہیں کشور کلینک پر کام کرتے ہوئے صرف ایک سال ہوا

ہے؟“

”جی، یہ سچ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

باتم نے کشور کلینک ہی سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا؟“

نہیں، اس سے پہلے میں ڈاکٹر عثمان حیدر کے کلینک پر کام کرتا تھا۔“ وہ وضاحت

کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کلینک میرے گھر کے قریب پی آئی بی کالونی میں ہے۔“
 ”جب تم نے کشور کلینک پر ملازمت کی تو تمہاری تنخواہ کتنی لگائی گئی تھی؟“
 ”چھ سو روپے۔“

”اس وقت..... میرا مطلب ہے، وقوعہ کے وقت تمہاری تنخواہ کتنی تھی؟“
 ”آٹھ سو روپے۔“ اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”آصف علی! تم روزانہ دس بجے کے قریب کلینک پہنچتے ہو۔ اس وقت سوپر جاوید یا تو کلینک کی صفائی کر رہا ہوتا ہے یا پھر تم چند منٹ اس سے پہلے آ جاتے ہو۔ جب تم اس سے پہلے کلینک پہنچتے ہو تو تمہیں بیرونی شٹر اگر اہولتا ہے یا اٹھا ہوا؟“
 ”جناب! رات والا کمپاؤنڈر ناصر یعنی ملزم صبح نو بجے تک کلینک سے رخصت ہو جاتا ہے اور اسے ڈاکٹر صاحب نے یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ جب بھی جائے، کلینک کے شٹر کو گر کر جائے اور وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ میں جب بھی جاوید سے پہلے کلینک پہنچا ہوں، مجھے شٹر گر اہولتا ملا ہے۔“

”کیا ملزم کو شٹر گرانے کی یہ ہدایت اس صورت میں بھی ہے کہ اگر کوئی اس وقت کلینک میں سویا ہوا ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
 ”نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔
 ”ڈاکٹر عمر حیات مہینے میں ایک دو مرتبہ کلینک ہی میں سو جایا کرتے تھے۔ ایسی صورت میں ناصر محمود کلینک کا بیرونی شٹر گرائے بغیر ہی چلا جایا کرتا تھا۔“

”وقوعہ کی رات..... یعنی رات کے آخری پہر ڈاکٹر عمر حیات کلینک ہی میں سویا ہوا تھا۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کاؤچ پر لیٹنے سے پہلے اس نے ملزم کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ رخصت ہوتے وقت اسے جگانے کی کوشش نہ کرے لہذا ملزم اپنے وقت پر شٹر اٹھا ہوا چھوڑ کر گھر چلا گیا تھا لیکن جاوید جب صفائی کرنے کے لیے آیا تو اسے شٹر گر اہولتا تھا۔ یہ کیا معما ہے؟“

”یہ تو واقعی ایک معما ہے!“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اگر ناصر شٹر گر کر نہیں گیا تھا تو پھر اسے کس نے گرایا؟“

”میں یہی سوال تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خیال میں کلینک کا سٹرکس نے گرایا ہوگا؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے قدرے نرمی سے کہا پھر پوچھا۔ ”آصف علی! کیا تم نے کسی بینک وغیرہ میں اکاؤنٹ بھی کھول رکھا ہے؟“

”جی ہاں، میں ایک مقامی بینک کا اکاؤنٹ ہولڈر ہوں۔“ اس نے جواب دیا پھر اپنے بینک کا نام بھی بتایا۔

میں..... بار بار سوالات کا زوایہ تبدیل کر رہا تھا تا کہ گواہ کو مطلق احساس نہ ہو کہ میں اس کی بے خبری میں، اس کی زبان سے کون سا راز اگلوانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

”آصف علی! وقوعہ کے روز تم نے فون کر کے ڈاکٹر یا در عباس کو کلینک بلوایا تھا۔ ڈاکٹر یا در نے آتے ہی اپنے ماموں کی موت کی تصدیق کر دی پھر فون کر کے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی گئی۔“ میں لمحے بھر کو رک کا پھر اضافہ کیا۔

”پولیس کی آمد سے قبل ہی تم نے کلینک کا معائنہ کر کے یہ بتا بھی چلا لیا کہ اس دن کا سارا کیش بھی غائب تھا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟“

”ماجر اکیا ہے جی۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”بس کیش غائب تھا!“

”ایسے بات نہیں بنے گی.....!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ذرا تفصیل سے مجھے بتاؤ کہ کلینک کے اندر کتنا کیش تھا، کہاں رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا؟“

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بتانے لگا۔ ”جناب! بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے کلینک پر مریضوں سے ڈاکٹر صاحب پیسے نہیں لیتے بلکہ چار جنگ ہم لوگ کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مریض کے نسخے پر اوپر ایک کونے میں خفیہ کوڈ ڈال دیا کرتے تھے، ہم سمجھ جاتے تھے کہ مریض سے کتنے پیسے وصول کرنا ہیں۔ رات کو جب ہماری شفٹ تبدیل ہوتی تھی تو میں پرچیوں (نسخوں) کے مطابق حساب بنا کر ناصر کو دے جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا کام شروع ہو جاتا۔ وہ صبح رخصت ہوتے وقت اپنا حساب بناتا اور ان دونوں حسابوں والی پرچیاں اور دن و رات کی

آمدنی کی رقم کو ایک لفافے میں ڈال کر ڈاکٹر یا در صاحب کی میز کی دراز میں رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”وقوع کے روز..... میرا مطلب ہے، ایک دن پہلے یعنی تین فروری کو دن اور رات کے پہلے حصے کا مجموعی حساب دو ہزار روپے بنا تھا جو کہ میں نے ناصر کے حوالے کیا اور اپنے گھر رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد کلینک پر کیا واقعات پیش آئے اس کی مجھے کچھ خبر نہیں۔ صبح جب میں کلینک پہنچا تو پتا چلا کہ کسی نے گلابا کر ڈاکٹر عمر حیات کو قتل کر دیا ہے۔ پولیس کو فون کرنے کے بعد جب ڈاکٹر یا در اور میں نے میز کی وہ دراز دیکھی جس میں کیش رکھا جاتا تھا تو ہمیں حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہاں دن اور رات کے مریضوں کا مکمل حساب تو لکھا رکھا تھا مگر رقم غائب تھی۔ ناصر کے ہاتھ کا حساب بھی بنا ہوا تھا جس کے مطابق رات کو کلینک کی ڈھائی ہزار کی آمدنی ہوئی تھی۔ یعنی رات اور دن کی رقم ملا کر کل ساڑھے چار ہزار روپے بنتے تھے جو کہ میز کی دراز میں موجود نہیں تھے۔ ان حالات میں ذہن ناصر کی طرف ہی جاسکتا تھا لہذا پولیس آئی، انہوں نے موقع کی کارروائی کی اور حالات و واقعات کی روشنی میں ناصر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ یہ ہے جناب کل کہانی.....!“

”خاصی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی ہے۔“ میں نے مزہ لینے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آصف علی! یہ بتاؤ کہ یہ بات کس کس کو معلوم تھی کہ دن اور رات بھر کی آمدنی کو یوں ڈاکٹر یا در عباس کی میز کی دراز میں رکھ دیا جاتا ہے؟“

”دونوں ڈاکٹروں اور دونوں ڈسپنسروں کے علاوہ کوئی پانچواں شخص یہ بات نہیں جانتا تھا۔“ وہ ہر دھوکے لہجے میں بولا۔ ”اور جہاں تک رقم دراز میں چھوڑنے کا سوال ہے تو یہ طریقہ بالکل محفوظ تھا۔ یہ رقم کوئی بونہی کھلی نہیں چھوڑ دی جاتی تھی بلکہ ایک لفافے میں رکھ کر اسے ڈاکٹر صاحب کے مختلف آلات کے نیچے بٹا دیا جاتا تھا۔ مذکورہ دراز میں ڈاکٹر صاحب کے، مریضوں کے کان، گلابا اور آنکھیں وغیرہ چیک کرنے کے آلات رکھے رہتے تھے۔ ہم چاروں کے علاوہ اگر کوئی شخص وہ دراز کھول کر اندر جھانک بھی لے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔“

”گویا رقم کی چوری کا سہرا انہی چار افراد میں سے کسی ایک کے سر باندھا جاسکتا ہے۔“ میں نے سننا تے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اصولاً چار میں سے دو افراد کو کٹ کر ناپڑے گا..... یہ ضروری ہے۔ نمبر ایک مقتول، نمبر دو ڈاکٹر یا در..... عمر حیات کو قتل کر دیا گیا لہذا اس پر چوری کا شبہ

نہیں کیا جاسکتا اور یا اور عباس چوری کے ان لمحات میں اپنے گھر میں موجود تھا لہذا وہ بھی شک سے بری ٹھہرتا ہے..... باقی بچتے ہو، تم دونوں یعنی ملزم ناصر محمود اور استغاثہ کا گواہ آصف علی..... کہیں یہ چوری.....!“

”اور میں جانتا ہوں، اس چوری میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ ”کیونکہ میں رات کا گیا جب صبح کلینک پہنچا تو قتل اور چوری کے واقعات پیش آچکے تھے.....!“

میں نے اس پر مزید کوئی وار نہیں کیا تا کہ اس کا دھیان بٹ جائے۔ اچانک میں نے ایک مرتبہ پھر سوالات کا زاویہ تبدیل کر دیا اور کٹہرے میں کھڑے گواہ سے پوچھا۔

”آصف علی! آپ نے ملزم کے ساتھ مل کر تقریباً ایک سال کام کیا ہے۔ میرا اشارہ رات دس بجے سے گیارہ بجے تک کلباؤں ڈیوٹی کی جانب ہے۔ اس دوران میں تم نے ملزم کی شخصیت، بول چال کے انداز، اطوار و عادات وغیرہ کا خاصا گہرا مشاہدہ کیا ہوگا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ..... کیا ملزم ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں وغیرہ پہننے کا بھی شوقین تھا؟“

”جی نہیں۔“ گواہ نے قطعیت سے جواب دیا۔ ”میں نے اسے کسی انگلی میں کبھی کوئی انگوٹھی پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔“

آصف علی سے پہلے سوپر جاوید نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ ملزم انگوٹھیاں وغیرہ پہننے کا عادی یا شوقین نہیں تھا لیکن پوسٹ مارٹم والی فائل میں جو رپورٹس لگی ہوئی تھیں ان میں سے ایک میں بڑے واضح طور پر لکھا تھا کہ قاتل نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں انگوٹھیاں وغیرہ پہن رکھی تھیں۔ مقتول کی گردن پر سے تلاش کیے جانے والے انگلیوں کے نشانات کے ساتھ ہی انگوٹھیوں کے مخصوص دباؤ کے آثار بھی نوٹ کیے گئے تھے..... اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کا یہ نکتہ میرے موکل کے حق میں جاتا تھا کیونکہ حالات و واقعات اور ثبوت و شواہد کی رو سے ملزم ناصر محمود انگوٹھیاں نہیں پہنا کرتا تھا۔

کرسی انصاف پر براجمان جج بڑی دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری کارکردگی اور مقصد کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے وکیل استغاثہ صولت رضوی کی جانب دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اپنی توجہ استغاثہ کے گواہ پر مرکوز کر دی۔

”آصف!“ میں نے کٹہرے میں کھڑے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر میں تم سے کوئی ذاتی نوعیت کا سوال کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”جی نہیں..... بالکل نہیں!“ وہ دونوں لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ”تمہارے اکاؤنٹ میں اس وقت کتنی رقم ہوگی؟“

”مم..... مجھے کچھ صحیح اندازہ نہیں ہے۔“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ کافی عرصے سے میں نے اپنا اکاؤنٹ چیک نہیں کیا۔“

”تم عموماً کتنے دنوں کے بعد اپنا اکاؤنٹ چیک کرتے ہو؟“

”میں اس کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“

”اس کا مطلب ہے، تمہارے اکاؤنٹ میں بڑی رقم جمع نہیں رہتی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مثلاً لاکھوں، کروڑوں.....!“

”جناب! آپ لاکھوں کروڑوں کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولا۔ ”جس شخص کی ماہانہ تنخواہ آٹھ سو روپے ہو اس کا اکاؤنٹ اتنا صحت مند کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ اکاؤنٹ بچت کے لیے کھولا تھا۔ کبھی دوسو، کبھی چار سو اس میں جمع کروا دیتا ہوں۔ اس وقت بہ مشکل میرے اکاؤنٹ میں دو، ڈھائی ہزار روپے ہوں گے جو میں نے پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں پیسا پیسا جمع کیے ہیں۔“

”دوسو، چار سو جمع کراتے رہے ہو اور اس وقت تمہارا بیلنس ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں.....“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر گواہ سے سوال کیا۔ ”ناصر! کیا تم نے صرف ایک ہی بینک میں اکاؤنٹ کھول رکھا ہے یا.....؟“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”صرف ایک بینک..... وہی بینک جس کے بارے میں، میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“

”آصف علی!“ میرے سوالات میں اچانک تیزی آ گئی۔ ”ذرا سوچ کر بتاؤ، پچھلے ایک سال کے دوران میں تم نے کبھی کوئی بڑی رقم بینک میں جمع کرائی ہو مثلاً..... تین، چار یا پانچ ہزار.....؟“

”نہیں جناب.....!“ وہ بانیں ہاتھ کی پشت سے ماتھے کے پسینے کو پونچھتے ہوئے بولا۔

”ایسا تو میری زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔“

”زندگی میں کبھی نہیں ہوا!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ”تو اس کا مطلب ہے یہ عدالت تمہیں زندہ نہ سمجھے، اس وقت تم زندگی سے خالی ہو؟“

”جی..... جی، میں کچھ سمجھا نہیں.....!“ وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

اس نے حیرت اور الجھن کی اداکاری کی تھی جیسے میں جو بھی کہنا چاہتا تھا وہ اس سے مطلق بے خبر ہو لیکن اس کی یہ ایکٹنگ مجھے قطعاً متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے بڑے وثوق سے سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے قدموں سے اکھڑ چکا ہے۔ کوئی جڑ سے اکھڑے یا قدموں پر ڈگمگائے، اسے زمین بوس کرنے کے لئے صرف ایک زوردار دھکے کی ضرورت ہوتی ہے اور میں نے بھی یہی کیا۔

”آصف علی!“ میں نے گواہ استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم کچھ سمجھے یا نہیں سمجھے ہو اس کا پتا ابھی چل جائے گا اور معزز عدالت یہ بھی جان لے گی کہ تمہارا شمار زندہ میں کیا جائے یا پھر.....؟“ میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا، ایک گہری سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آصف! تم نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو یہ بیان دیا ہے کہ تم نے اپنی پوری زندگی میں دو، تین یا چار ہزار کی رقم یک مشت بینک میں جمع نہیں کرائی لیکن پانچ فروری کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ تم نے چار ہزار پانچ سو روپے اپنے اکاؤنٹ میں ڈیپازٹ کیے تھے یعنی، پورے ساڑھے چار ہزار روپے..... لہذا تمہارے بیان کی روشنی میں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ تم پانچ فروری سے قبل ہی انتقال کر گئے تھے کیونکہ بقول تمہارے..... یہ کام تمہاری زندگی میں تو ہوا نہیں..... ہوں.....؟“

”آہنجیکھن یور آرز!“ وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! وکیل صفائی غیر متعلقہ باتوں میں گواہ کو الجھا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔“

”جناب عالی! ابھی تک میری زبان سے ایک لفظ بھی غیر متعلق خارج نہیں ہوا۔“ میں نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں نرمی سے کہا۔

پیری اس نرمی کو کمزوری سمجھ کر وہ شیر ہو گیا۔ براہ راست میری جانب دیکھتے ہوئے اس

نے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔ ”زیر سماعت کیس سے اس بات کا کیا تعلق ہے..... آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ پانچ فروری کو استغاثہ کے گواہ آصف علی نے اپنے اکاؤنٹ میں ساڑھے چار ہزار روپے ڈیپازٹ کیے تھے؟“

”اس بات کا ثبوت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بینک کارپیکارڈ میرے دعوے کی تصدیق کر سکتا ہے اور ضرورت محسوس ہونے پر فروری کے مہینے کی اسٹیٹ منٹ نکلائی جاسکتی ہے لیکن.....“ میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا پھر افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”میرے فاضل دوست! میرا جی چاہ رہا ہے کہ آپ کی عقل..... یا کم از کم آپ کی یادداشت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کروں بلکہ اگر موقع ملے تو ماتم بھی کر ڈالوں.....!“

”کیوں.....!“ وہ سگ کر بولا۔ ”میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟“

میں نے اس کی سلگن پر نمک پاشی کرتے ہوئے نہایت ہی کڑوے لہجے میں کہا۔ ”آپ کی یادداشت کا میں نے اس لیے ذکر کیا ہے کہ ڈاکٹر عمر حیات کا قتل چار فروری کی صبح ہوا تھا اور اسی روز یہ انکشاف بھی ہوا کہ کلینک کی دن رات کی آمدنی مبلغ چار ہزار پانچ سو روپے ڈاکٹر کی میز کی دراز میں سے غائب ہو گئی تھی۔ ان دونوں معاملات کو میرے مؤکل کی گردن سے لپیٹ کر آپ اس طرح خوش ہو رہے ہیں کہ جیسے کوئی دنیا کا عظیم کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ انہی حالات میں وقوعہ کے اگلے روز یعنی پانچ فروری کی صبح استغاثہ کا گواہ آصف علی اپنے اکاؤنٹ میں اتنی ہی مالیت کی رقم جمع کراتا ہے لیکن معزز عدالت میں وہ اس بات کا دعویدار ہے کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنی بڑی رقم ڈیپازٹ نہیں کی۔“ میں نے چند لمحات کے لیے توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”..... اور میرے فاضل دوست! آپ کی عقل کا ماتم میں اس ذیل میں کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ان دو واقعات بلکہ دو معاملات میں کوئی ربط ضبط اور تعلق واسطہ نظر نہیں آ رہا..... ہے نا یہ..... بڑے افسوس کی بات!“

وکیل استغاثہ میرے اس کڑے استفسار پر جھل سا ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے اسے ندامت اور شرمندگی کے بحر بیکراں میں ڈبکیاں کھاتے چھوڑا اور استغاثہ کے گواہ آصف علی کی

جانب متوجہ ہو گیا۔

”آصف!“ میں نے ڈانٹ سے مشابہ انداز میں کہا۔ ”تم نے پانچ فروری کو اپنے اکاؤنٹ میں ساڑھے چار ہزار روپے جمع کرائے تھے یا نہیں..... مجھے ”ہاں“ یا ”نہ“ میں جواب چاہیے؟ اور یہ مت سوچنا کہ میں نے بینک اسٹیٹ منٹ والی بات بس ایسے ہی کی ہے۔ اسے خالی خولی دھمکی نہ سمجھنا میں نے اس سلسلے میں تمہارے بینک منیجر سے بات کر لی ہے۔ بس، عدالت کے حکم کی دیر ہے.....!“

”ہاں.....!“ وہ کمزور سے لہجے میں بولا اور کٹہرے کی ریلنگ کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔
میں نے بینک منیجر سے بات کرنے کا محض جھانسا دیا تھا۔ یہ حقیقت نہیں تھی مگر وہ حوصلہ ہار گیا۔ میں نے بڑی سرعت سے اس کی کمر پر کاری وار کیا۔ ”یہ وہی رقم تھی نا جو تم نے ڈاکٹر کی میز کی دراز میں سے چرائی تھی..... ڈاکٹر عمر حیات کو.....؟“
”میں نے ڈاکٹر عمر حیات کو قتل نہیں کیا!“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ”اور میں نے یہ رقم.....!“

وہ بولتے بولتے ایسے رکا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو لیکن میں اس مرحلے پر اسے رکنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے میں نے کہا۔

”آصف! میں جانتا ہوں کہ تم نے ڈاکٹر عمر حیات کو قتل نہیں کیا اور مذکورہ رقم تم نے، موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس وقت چرائی جب تم ڈاکٹر یاور عباس کو فون کر کے کلینک کا ”معائنہ“ فرما رہے تھے..... یہی کہنا چاہتے ہو نا؟“ میں نے لمحے بھر کو رک کر سوالیہ نظروں سے گواہ کی طرف دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”دفعہ کے روز کلینک کی جو صورت حال تھی اس سے تم نے بھانپ لیا تھا کہ قتل کی اس واردات کا سارا شک ناصر محمود کی طرف جا رہا تھا لہذا اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے تم نے دن و رات بھر کی آمدنی اڑالی۔ اگلے روز یعنی پانچ فروری کو تم نے یہ چوری شدہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈیپازٹ کروا دی۔ تمہیں یقین تھا کہ رقم کی یہ چوری بھی ملزم ہی کے کھاتے میں جائے گی اور دیکھو..... بالکل ایسا ہی ہوا۔ تم قاتل نہیں ہو، صرف ایک موقع پرست چور ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا

تا؟“

وہ ریلنگ کو تھامے تھامے ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ”مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں لالچ میں آ گیا تھا۔ ان لمحات میں شیطان نے میری سوچ کا اسٹیرنگ غلط سمت میں گھمادیا تھا۔ میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔“

”انسان دو چیزوں کا پتلا ہے آصف۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”نمبر ایک، مٹی، نمبر دو، خطا۔ اگر کوئی انسان ہے تو اس سے زندگی میں خطا بھی ہوگی کیونکہ اس مشن کے لیے شیطان چوبیس گھنٹے انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ بہر حال، یہ اچھی بات ہے کہ تم اپنے کیے پر نادم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم چوری شدہ رقم ڈاکٹر یاد عباس کے حوالے کر دو تو وہ تمہیں نہ صرف یہ کہ معاف کر دیں گے بلکہ تمہاری نوکری بھی بحال رہے گی۔“

”بہت بہت مبارک ہو میرے فاضل دوست!“ صولت رضوی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ایک کیس تو حل کر دیا لیکن ڈاکٹر عمر حیات کے قتل کا معاملہ ابھی باقی ہے!“

”استغاثہ کا ایک گواہ بھی تو ابھی باقی ہے؟“ میں نے اس کے طنز کا منہ توڑ جواب دیا۔

”کیا مطلب.....!“ وہ چونکا نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”رضوی صاحب! میں نے کوئی ایسی پیچیدہ بات تو نہیں کر دی جس کا مطلب اخذ کرنا آپ کے بس میں نہ ہو؟“ میں نے ڈرامائی توقف کر کے وکیل استغاثہ کو گھورا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”استغاثہ کے گواہوں کی فہرست آپ کی جانب سے دائر کی گئی تھی اور آپ ہی اپنے ایک ممبر کو بھولے بیٹھے ہیں۔ لگ بھگ نصف درجن گواہ، شہادت کے لیے عدالت میں پیش ہو چکے ہیں۔ صرف ایک باقی بچا ہے۔ آپ اسے عدالت میں پیش کریں۔ آپ کا دوسرا مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا..... میں نادر خان کی بات کر رہا ہوں!“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے چار روز کے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔



نادر خان ایک قوی الجشہ اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے کھربا قلموں کے ساتھ ایک

مخصوص قسم کا ہیز اسٹائل بنا رکھا تھا تاہم اس کے سر کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان زہی ہوگی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وٹنس باکس میں کھڑا تھا۔ جب وہ گواہی کے لیے عدالت میں پیش ہوا تو خاصا نروس دکھائی دیتا تھا۔ اس میں اور وکیل استغاثہ میں وہ میلان نظر نہیں آتا تھا جو اس ”رشتے“ کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ میں کوآرڈینیٹیشن کے اس فقدان کا سبب جانتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ جج کو بھی اس معاملے کا پورا ”آئیڈیا“ ہو چکا تھا۔ پچھلی پیشی پر بہت کچھ واضح ہو گیا تھا جہی گذشتہ پیشی پر اس نے صرف چار دن بعد کی تاریخ دی تھی۔ گواہ حلفیہ بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے پاس پہنچ گیا۔ میری توقع کے برخلاف صولت رضوی نے نہایت ہی مختصر سی جرح کے بعد مجھے ٹرن دے دی۔ وکیل استغاثہ کے اس ماتھے طرز عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے تعزیے کم و بیش ٹھنڈے ٹھار ہو چکے ہیں۔ میں جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کے گواہ کی طرف بڑھ گیا۔

”خان صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے تو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے؟“

شاید وہ مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا، آنکھیں سیکڑ کر اس نے مجھے دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وکیل صاحب! میں آپ کو نہیں جانتا۔ بس، اتنا پتا ہے کہ آپ ملزم کے وکیل ہیں۔“

”ملزم کا وکیل تو میں اس عدالت میں ہوں۔“ میں نے اس کے تصور کے برخلاف خاصے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میں عدالت سے باہر واقع آپ کے ہوٹل کی بات کر رہا ہوں۔ میں اکثر آپ کے ہوٹل سے چائے پینے آ جاتا ہوں۔ آپ کی چائے کا اپنا ایک منفرد ذائقہ ہے اور چائے بنانے میں آپ اس قدر رگن ہوتے ہیں کہ شاید آپ نے کبھی مجھ پر دھیان نہیں دیا۔ آپ کے دونوں ہاتھ مشین کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ اسی انہماک کے سبب آپ نے کبھی مجھ پر توجہ نہیں دی ورنہ آپ دیکھتے ہی فوراً مجھے پہچان جاتے!“ یہ میں نے ایک انوکھی چال چلی تھی۔

”ہاں..... ایسا ہو سکتا ہے!“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ ”لیکن آپ اپنے قریبی رشتے داروں کو تو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہوں

گئے؟“

”جی.....جی ہاں!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”خان صاحب! آپ کو اپنے بہنوئی کا بہنوئی تو اچھی طرح یاد ہوگا۔ میں فیروز خان کی بات کر رہا ہوں؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ”اگر آپ نے اپنے بہنوئی تقدیر خان کے بہنوئی فیروز خان کو یاد رکھا ہوا ہے تو پھر آپ فیروز خان کی بیوی یعنی تقدیر خان کی بہن کو بھی نہیں بھولے ہوں گے اور وہ واقعہ بھی آپ کی یادداشت میں محفوظ ہوگا جب ایک رات کشور کلینک پر بل کی عدم ادائیگی کی وجہ سے مقتول ڈاکٹر عمر حیات نے فیروز خان کی بیوی زری گل کی طلائی بالیاں اتروا کر اپنے پاس گروی رکھ لی تھیں؟“

وہ دانت پیستے ہوئے کڑوے لہجے میں بولا۔ ”میں اس واقعے کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس موقع پر زری گل نے میرا حوالہ بھی دیا تھا لیکن اس درندے کو ذرا لحاظ نہ آیا اور اس نے.....!“

نادر خان نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ”غالباً آپ نے مقتول ڈاکٹر کو درندہ کہا ہے؟“

”جی ہاں.....“ وہ طیش بھرے لہجے میں بولا۔ ”کیا آپ کے خیال میں اس نے انسانوں والی حرکت کی تھی؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”وہ ایک نہایت ہی گھٹیا اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت تھی۔ میں تو کہتا ہوں، ایسے درندوں کو پہلی فرصت میں موقع ملے ہی تلف کر دینا چاہیے!“ میں نے اس کے اندر چھپے ہوئے ایک ایسے شخص کو باہر لانے کی کوشش کی تھی جو اس کیس میں مرد مذکور کی حیثیت کا حامل تھا!

میرے رہنما کس پر وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکٹر عمر حیات کے ذکر نے اسے آتش زیر پا کر دیا تھا۔ میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے مجھے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ اضطرابی لہجے میں، میں نے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔

”اور ہاں، خان صاحب! آپ کے ہاتھوں کا اب کیا حال ہے۔ آپ اپنی دو انگلیوں کے علاج کے لیے کسی حکیم صاحب کی دوا کھا رہے تھے..... آپ کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں

پھلسمیری کا مرض ہے نا.....؟“

”پھلسمیری..... حکیم کا علاج.....؟“ وہ شپٹائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ

رہے ہیں.....؟“

”اپنے دونوں ہاتھوں کو سامنے لائیں..... شاباش!“ میں نے پکپکارنے والے انداز

میں کہا۔ ”میں دکھاتا ہوں، آپ کی کون سی دو انگلیاں متاثر ہیں..... دائیں ہاتھ کو آگے

لائیں.....!“

میں نے اتنی خوب صورتی اور مہارت سے جال پھینکا تھا کہ وہ فوراً میری چال میں

آ گیا۔ اس نے پشت پر بندھے ہوئے دونوں ہاتھ ایک جھکے سے کھولے اور میرے سامنے پھیلا

دیئے۔ میں نے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کی جڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں خان صاحب! ان دو انگلیوں کی جڑوں کا رنگ آپ کی مجموعی رنگت سے بہت

زیادہ سفید ہے۔ یہی تو ہے پھلسمیری کا مرض جس کے لیے آپ ایک حکیم صاحب.....؟“

”یہ پھلسمیری نہیں ہے۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی جو شیلے لہجے میں

بولا۔ ”یہ تو انگوٹھیوں کی وجہ سے نشانات بن گئے ہیں۔“

”ایسے واضح اور گہرے نشانات ہاتھ کی انگلیوں پر اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب

سالہا سال سے انگوٹھیاں پہنی جا رہی ہوں۔“ میں نے جرح کے زاویے کو اپنے مقصد پر فوکس

کرتے ہوئے دھواں دھارا انداز میں کہا۔ ”عدالت میں آنے سے پہلے آپ نے اپنی انگوٹھیاں

کیوں اتار دیں نادر خان..... کہیں آپ کے وکیل نے آپ کو یہ تو نہیں بتا دیا تھا کہ پچھلی پیشیوں پر

عدالت میں انگوٹھیوں کا کچھ زیادہ ہی تذکرہ ہوا ہے..... ہوں؟“

”کک..... کیا مطلب ہے..... آپ کا؟“ وہ نکھری ہوئی آواز میں بولا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ.....“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”درندوں کو تلف

کرنا ضروری ہو جائے تو انسان موقع محل دیکھ کر فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتا اگر شر بھی کھلا ہوا مل

جائے اور یہ بھی پتا ہو کہ درندہ گہری نیند میں ہے تو خواخواہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بڑی

قاتلانہ سی سرسراہٹ ہونے لگتی ہے..... آپ نے بھی.....“

میری بات مکمل نہیں ہونے پائی تھی کہ عدالت کے کمرے میں ایک عجیب واقعہ رونما

ہوا۔ استغاثہ کے آخری گواہ نادر خان نے کٹہرے میں سے نکل کر اچانک خارجی دروازے کی جانب دوڑ لگادی۔ اس صورت حال نے جج کو ہنگامی احکامات صادر کرنے پر مجبور کر دیا۔

متعلقہ عدالت میں شامل دوسادہ لباس پولیس اہلکاروں نے آن واحد میں جست بھری اور عدالت کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی نادر خان کو دبوچ لیا۔ اس کارروائی میں کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپٹر امداد علی نے بھی سادہ لباس اہلکاروں کی بھرپور مدد کی۔

میری ”محنت“ نے آئی۔ او کی آنکھیں کھول دی تھیں!



نادر خان سے اقبال جرم کرانے میں پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق انگوٹھیاں پہنے دو مضبوط ہاتھوں نے مقتول کا گلا دبا کر اسے موت سے ہم کنار کیا تھا۔ نادر خان نے تسلیم کیا کہ وہ انگوٹھیاں بردار ہاتھ اسی کے تھے۔ مقتول نے اس کے بہنوئی تقدیر خان کی بہن زری گل کے ساتھ پچیس مارچ کی رات جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ اسے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

نادر خان نے اپنے اقبال جرم میں بتایا کہ وہ دن رات ڈاکٹر عمر سے انتقام لینے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا لیکن وہ اس کام کو ایسی خوب صورتی سے انجام دینا چاہتا تھا کہ کوئی بھی شک آلود انگلی اس کی طرف نہیں اٹھے پھر چار فردری کی صبح آٹھ بجے جب ملزم ناصر محمود گھر جانے لگا تو اس نے نادر خان کو بتایا کہ وہ کلینک کا شٹر نہیں گرا کر جا رہا کیونکہ اندر ڈاکٹر عمر حیات سویا ہوا ہے۔ ملزم کی عادت تھی کہ وہ جاتے وقت کلینک کا شٹر گراتا اور نادر خان کو بتاتا تھا کہ وہ گھر جا رہا ہے۔ نادر خان کا چائے خانہ کلینک کے بازو سے لگا ہوا تھا اور بعض اوقات نادر خان چائے کی تیاری کے دوران میں کلینک پر بھی حفاظتی نگاہ رکھتا تھا۔

ایسے میں ہی نادر خان کے ذہن میں انتقام کا جولاوا پک رہا تھا اسے اخراج کی راہ مل گئی۔ ملزم کے جانے کے بعد وہ خاموشی سے کلینک میں داخل ہوا، بے خبر سوئے ہوئے ڈاکٹر عمر حیات کو گلا گھونٹ کر زندگی کی قیوسے آزادی دلائی اور شٹر گرا کر دوبارہ اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ کلینک کا شٹر اس نے محض اس لیے گرایا تھا کہ شک کے سارے تیر ملزم کی سمت پرداز کر جائیں۔

ایسا سوچتے ہوئے وہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ..... اس کائنات میں، ایک ایک ذرے کے فاصلے پر کوئی ایسی قوت بھی موجود ہے جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا مگر اس کی سب پر گہری نظر ہے اور جب کوئی نادر خان کی طرح منصوبہ بندی کرتا ہے تو وہ قوت معنی خیز انداز میں مسکرانے پر اکتفا کرتی ہے!

چور اور قاتل کی کہانی تو اختتام کو چھونے میں کامیاب ہو گئی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مقتول کو گہری نیند میں پہنچانے کا کارنامہ کس نے انجام دیا تھا۔ بالآخر یہی سوچ لیا گیا کہ مقتول ڈاکٹر عمر حیات نے سونے سے قبل کوئی مسکن دوا لے لی ہوگی اور وہ دوا ”اور ڈوز“ ہو گئی ہوگی!

سیانے لوگ شاید اسی لیے میانہ روی پر زور دیتے ہیں۔ یہ اور اینڈ انڈر والے معاملے ہمیشہ انسان کے لیے مصائب کھڑے کرتے ہیں اور بعض اوقات مصائب کے یہ پہاڑ اس قدر بلند اور روزنی ہوتے ہیں کہ انسان کی عمر اور حیات ان کے بوجھ تلے پس کر رہ جاتی ہے!



دوست دشمن

ناشتے کے دوران صبح کے اخبارات کو میں سرسری انداز میں دیکھ لیا کرتا ہوں۔ میرے پیشے کی مصروفیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں فرصت سے بیٹھ کر اخبارات کی ایک ایک سطر چاٹتا رہوں۔ میرے خیال میں اپنے کام اور مطلب کی خبروں کو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں بھگتنا یا جاسکتا ہے۔ یعنی ادھر ناشتہ ختم، ادھر اخبارات صاف!

اس روز بھی میں ناشتے کی میز پر بیٹھا اخبارات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک خبر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ بعض اوقات اخبارات والے عوام کی دلچسپی حاصل کرنے کے لیے بڑے انوکھے رنگ ڈھنگ سے خبر لگاتے ہیں۔ میں نے ابھی جس خبر کا ذکر کیا ہے اس کا متن کچھ اس طرح سے تھا۔

ایک برنس مین نے اپنے سلسپنگ پارٹنر کو ابدی نیند سلا دیا۔

میں نے اس خبر کی تفصیلات میں جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہاں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دو افراد نے جو کہ آپس میں دوست بھی تھے، مل کر ایک برنس شروع کیا تھا اور کچھ عرصے کے بعد ایک پارٹنر کی موت واقع ہو گئی تھی۔ یہ موت قتل کی صورت میں سامنے آئی تھی۔ اس برنس میں، موت کو گلے لگانے والے شخص کی حیثیت ”سلسپنگ پارٹنر“ کی تھی لہذا پولیس نے پہلی فرصت میں ”بیدار پارٹنر“ کو اس قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا.....!

اس نوعیت کی خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں جو لوگوں کو سنسنی کے علاوہ تفریح کے مواقع بھی فراہم کرتی ہیں۔ میں نے اخبار کو ایک طرف رکھا اور جلدی سے تیار ہو کر

عدالت چلا گیا۔

بعض اوقات اور معاملات ایسے ہوتے ہیں، بظاہر جن سے پیچھا چھڑا کر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن وہ ہمارا پیچھا چھوڑنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتے اور نہایت ہی خاموشی سے تعاقب کرتے ہوئے اچانک ہمارے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

سلیپنگ پارٹنر کے قتل والا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا!
اسی شام میں اپنے دفتر میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا کہ میری سیکریٹری فوزیہ نے انٹرکام پر مجھے بتایا۔

”بیگ صاحب! بیگم زرینہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ان کا اپائنٹ منٹ ہے؟“

”اپائنٹ منٹ تو نہیں ہے سر!“

”پھر.....؟“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”سر! وہ خاصی پریشان دکھائی دیتی ہیں۔“ فوزیہ نے بتایا۔

”وزیٹنگ لابی کی کیا پوزیشن ہے؟“

”بیگ صاحب! لابی میں اس وقت تو صرف وہی بیٹھی ہوئی ہیں۔“

”وہی..... تمہارا مطلب ہے، بیگم زرینہ؟“

”لیس..... لیس سر!“

میں نے استفسار کیا۔ ”کیا آج کے تمام اپائنٹ منٹس منٹ گئے؟“

”دو کلائنٹس نے فون کر کے اپنی اپائنٹ منٹ کینسل کروائی ہیں۔“ سیکریٹری نے

جواب دیا۔ ”ان میں سے ایک کل اور دوسرا پرسوں آئے گا۔ آج کے اپائنٹ منٹس کے مطابق،

آخری کلائنٹ اس وقت آپ کے چیمبر میں موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جیسے ہی

مذکورہ کلائنٹ کو فارغ کروں، تم بیگم زرینہ کو میرے چیمبر میں بھیج دینا۔“

”اوکے سر.....!“ فوزیہ نے شائستہ لہجے میں کہا۔

میں نے انٹرکام کا ریسپورڈ رکھ دیا۔

پندرہ منٹ کے بعد، فوزیہ نے تین افراد کو میرے پاس بھیج دیا۔ ان میں ایک عورت، ایک نوجوان مرد اور ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ انٹرکام پر بات کرتے ہوئے فوزیہ نے مجھے صرف بیگم زرینہ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ عورت یقیناً بیگم زرینہ تھی۔ جبکہ باقی، ظاہر ہے اس کے ساتھی ہوں گے۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور اپنی میز کی دوسری جانب کچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ میرے اشارے کی تقلید میں کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔

رہی علیک سلیک کے بعد میں نے ان کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔ عورت نے متذبذب نظر سے ادھیڑ عمر مرد کی طرف دیکھا، جیسے وہ اس سے بات شروع کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ مرد نے اپنی ساتھی عورت کی نگاہ کا مفہوم سمجھ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”مرزا صاحب! میرا نام اکمل خٹک ہے۔ میں گلشن اقبال میں رہتا ہوں اور طارق روڈ پر میرا ایک چھوٹا سا فاسٹ فوڈ ریسٹورانٹ ہے۔“ پھر اس نے اپنے ہمراہی افراد کی جانب باری باری اشارہ کرتے ہوئے ان کا تعارف کرایا۔

”یہ میری بھابی زرینہ ہیں اور ان کے ساتھ، ان کا بیٹا عمیر بیٹھا ہے۔ ہمیں نجی صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری سمت بڑھا دیا۔ میں نے اس کارڈ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا تو فوراً پہچان گیا۔ یہ کارڈ میرے ایک تعلق دار عارف نجی کا تھا جو صبح کے ایک معروف اخبار کارپورٹر تھا۔ مذکورہ کارڈ کے پیچھے نجی صاحب نے میرے لیے چند سطریں گھسیٹ دی تھیں۔

”بیگ صاحب! اکمل خٹک سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ان کے بڑے بھائی اجمل خٹک قتل کے ایک کیس میں پھنس گئے ہیں۔ میں اجمل صاحب کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہیں قانونی مدد کی ضرورت ہے..... نجی۔“

نجی کے یہ الفاظ میرے لیے کافی تھے۔ ان لوگوں کی قانونی مدد کرنا مجھ پر لازم تھا۔ نجی نے انہیں ”جاننے“ کا جو حوالہ دیا تھا اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اجمل خٹک کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بد قسمتی نے اسے اس چکر میں پھنسا دیا تھا۔

میں نے منجی کے ویزیٹنگ کارڈ کو میز پر رکھا اور انٹرکام اٹھا کر تین کولڈ ڈرنکس لانے کے لیے کہہ دیا پھر اکمل خٹک کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”خٹک صاحب! آپ نے اپنا تعارف تو کر دیا۔ اب یہ بھی بتائیں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں..... میرا مطلب ہے کہ مجھے اس کیس کی تفصیل بتائیں جس میں آپ کا بھائی پھنس گیا ہے۔“

”مرزا صاحب! آج کے تمام اخبارات میں اس واقعے کی خبریں موجود ہیں۔“ اکمل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ خبر تو آپ کی نظر سے بھی گزری ہوگی کہ ایک بزنس مین نے اپنے سلیپنگ پارٹنر.....“

”ہاں، ہاں۔ میں نے یہ خبر پڑھی ہے۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ ”جس میں بزنس پارٹنر کو اب دی نیند سلائے کا ذکر تھا؟“

”اللہ آپ کا بھلا کرے مرزا صاحب!“ اکمل خٹک نے بڑی رسائی سے کہا۔ ”میں اسی خبر کی بات کر رہا ہوں۔ اب میں آپ کو اس کے بارے میں تفصیل سناتا ہوں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے.....!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے حالات سے آگاہی کے بعد ہی میں کسی مناسب کارروائی کے بارے میں فیصلہ کر سکوں گا۔“

اکمل خٹک نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بتانے لگا۔ ”مرزا صاحب! بھائی صاحب کی مصیبت کی کہانی خاصی طویل ہے۔ آپ سنتے سنتے پور تو نہیں ہو جائیں گے!“

”ہر گز نہیں.....“ میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ”اگر میں اپنے کلائنٹس کے مسائل سن کر بور ہونے لگوں تو پھر انہیں انصاف کیسے فراہم کر سکوں گا۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے مسکراتی ہوئی نظروں سے اپنے مخاطب کو دیکھا۔ ”خٹک صاحب! آپ بے فکر ہو کر اپنے ”بھائی صاحب“ کے حالات سے مجھے آگاہ کریں۔ میں پوری توجہ سے آپ کی بات سن رہا ہوں۔“

”شکریہ مرزا صاحب.....!“ وہ شکرانہ لہجے میں بولا۔

آئندہ بیس پچیس منٹ میں اکمل خٹک نے مجھے اپنے بھائی کے بارے میں جو کچھ بتایا،

میں یہاں اس کا خلاصہ آپ کے ذوق مطالعہ کے لیے پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر لیں۔ اس میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد ازاں پتا چلی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب کے پیش نظر میں نے انہیں بھی شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح بعض غیر متعلق باتوں اور واقعات کو میں نے دانستہ حذف کر دیا ہے تاکہ تحریر کی روانی اور آپ کی دلچسپی برقرار رہے۔



اجمل خٹک ایک پڑھا لکھا اور مہذب شخص تھا۔ اس کی عمر بچپن کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ الیکٹرونکس کے بزنس سے وابستہ تھا اور اس کا روبرو جدید بنیادوں پر بڑے نظم و ضبط سے چلا رہا تھا۔ صدر کی الیکٹرونکس مارکیٹ میں اس نے اپنا ایک عالی شان آفس بنا رکھا تھا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ صدر کی الیکٹرونکس مارکیٹ اور عالی شان آفس.....!

جی ہاں، یہی صورت حال تھی۔ دراصل اجمل خٹک فرنیچر اور ٹی وی وغیرہ کے کام سے تعلق نہیں رکھتا تھا، نہ ہی ایسے کسی اور برقی آلات کی فروخت سے اس کا واسطہ تھا۔ وہ الیکٹرونکس اسپیر پارٹس کے بزنس سے منسلک تھا۔ وہ الیکٹرونک پارٹس دنیا کے مختلف ممالک سے منگوا کر یہاں فروخت کرتا تھا۔ وہ خود بھی فرانس، جرمنی، سنگاپور، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ اور یورپ و جنوبی ایشیا کے دیگر ملکوں کے کاروباری دورے کرتا تھا اور اس کے بعض ایجنٹ بھی یہ کام کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ”کھپ“ کے کام کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ اس سے وابستہ کھپھی سنگاپور، ہانگ کانگ اور بینکاک وغیرہ کے کباڑ خانوں میں ”تلاش معاش“ میں مصروف رہتے تھے اور وہاں سے کام کی بہت سی اشیاء برآمد کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے جو بعد ازاں وہ اپنے سامان میں رکھ کر پاکستان لے آیا کرتے تھے۔

یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں زائد المیہ ایشیا کو استعمال میں نہیں رکھا جاتا۔ انہیں ڈسپوز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ اشیاء کاٹھ کباڑ کی صورت اختیار کر کے جنک یارڈ (ماڈرن کباڑ خانہ) میں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ جنک یارڈ ہی دراصل پاکستانی کھپیوں کی نظروں میں اہم ہوا کرتے تھے۔ وہ عملے کے افراد سے علیک سلیک کر کے وہاں گھسنے کی راہ بنا لیا کرتے تھے۔ جنک یارڈ والوں

کا تو بوجھ ہی ہلکا ہوتا تھا کیونکہ انہوں نے اس کا ٹھکبھاڑ کو بالآخر ٹھکانے ہی لگانا ہوتا تھا تاہم کھپی ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مطلب کی چیزیں برآمد کر لیا کرتے تھے جن میں زیادہ تر الیکٹرونک کے اسپئیر پارٹس ہوا کرتے تھے۔ ان کھپیوں کے مراکز نگاہ عموماً سنگاپور، بینکاک اور ہانگ کانگ تھے۔ یورپ کے دورے اجمل خٹک خود کرتا تھا اور مختلف کمپنیوں سے باقاعدہ آرڈر پر مال منگواتا تھا۔ اس طرح اس کا پردہ قائم تھا کہ وہ ایک رجسٹرڈ امپورٹر ہے۔ اسی پردے کے پیچھے وہ کھپیوں سے خریدا ہوا مال بھی دیدہ زیب پیکنگ کے بعد بہ آسانی کھپا دیا کرتا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ صدر کی الیکٹرونکس مارکیٹ میں اجمل خٹک کا ایک شاندار آفس تھا تو یہ غلط نہیں ہے۔ اس نے الیکٹرونکس مارکیٹ کی ایک بلڈنگ کے تھرو فلور پر تین بڑے کمرے لے رکھے تھے۔ جن میں سے ایک بطور دفتر استعمال ہوتا تھا۔ دوسرے میں اسپئیر پارٹس شیشے کے خوب صورت ڈبوں میں ڈسپلے کے لیے رکھے گئے تھے اور تیسرا کمرہ کاریگروں کے کام کے لیے تھا جو وہاں مختلف نوعیت کے کام کرتے تھے جن میں ریپرینگ اور پیکنگ وغیرہ شامل تھا۔ اجمل خٹک کو مختلف اداروں اور کمپنیوں کی جانب سے سپلائی کے جو بھی آرڈرز ملتے تھے ان کی پیکنگ وغیرہ آفس کے اسی کمرے میں ہوتی تھی۔ اس کے پاس چار ماہر ملازم کام کرتے تھے۔

اجمل خٹک کا یہ بزنس بڑے ٹھٹھاٹھ سے چل رہا تھا۔ اس کے پاس آرڈرز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بعض اوقات تو اسے مطلوبہ سپلائی فراہم کرنے میں دن رات بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ جب بزنس اس نوعیت کا ہو تو ظاہر ہے، انسان کے پاس روپے پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ قدرت اجمل خٹک پر بھی پوری طرح مہربان تھی۔ وہ ڈیفنس سوسائٹی کے فیئر ٹو میں رہائش پذیر تھا۔ اللہ نے اسے ایک وفادار بیوی اور تین بیٹے عطا کر رکھے تھے جن میں سب سے بڑا عمر بیس سال کا تھا، اس سے چھوٹے ڈیشان کی عمر لگ بھگ بارہ سال تھی جبکہ سب سے چھوٹا اسد آٹھویں سال میں تھا۔ اجمل کی بیوی زریہ بیگم ایک سنجیدہ اور پرکشش عورت تھی۔ زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی کہ ایک روز اجمل خٹک کو اپنے بزنس پارٹنر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

مقتول کا نام رئیس تھا اور ان کی پارٹنرشپ کو لگ بھگ ایک سال ہو گیا تھا۔ اجمل خٹک کو پارٹنرشپ کی ضرورت انتہائی ایمرجنسی کی صورت میں پیش آئی تھی اور دوسری جانب مقتول رئیس بھی حالات کے ہاتھوں ایسا بے بس اور مجبور ہو چکا تھا کہ دونوں کا ملاپ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ رئیس

اور اجمل خٹک کی خاصی پرانی جان پہچان تھی۔ رئیس کی صدر ہی کے علاقے میں جیولری کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جس پر اچانک زوال سا آ گیا اور دھندار فتنہ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا تھا۔ اجمل کو رئیس کے حالات کا علم تھا۔ کبھی اجمل خٹک اس کی دکان پر چلا جاتا اور کبھی رئیس اس کے آفس کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ ایک روز رئیس سخت پریشانی کے عالم میں اجمل خٹک کے پاس پہنچا۔

اجمل نے رمی علیک سلیک کے بعد اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے یار..... آج تو تم کچھ زیادہ ہی الجھے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ یہ تو تمہارے دکان پر بیٹھنے کا وقت ہے.....!“

”میں نے آج دکان نہیں کھولی.....“ رئیس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔ ”میں گھر سے سیدھا تمہاری طرف آیا ہوں!“

”دکان نہیں کھولی..... کیا مطلب.....؟“

”بس یار..... دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا پھر اجمل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یار خٹک! میں بڑے خطرناک حالات سے دوچار ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا..... کیا کروں..... کہاں جاؤں.....؟“

”نئی بیوی نے تنگ کر رکھا ہے.....؟“ اجمل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ہوں.....“ رئیس نے پرسوج انداز میں جواب دیا۔ ”ہاں..... کچھ ایسی بھی بات ہے۔“

”کچھ ایسی“ بھی“ بات کا کیا مطلب.....!“ اجمل نے کریدنے کی کوشش کی۔ ”میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ تم اپنے کاروباری حالات کی وجہ سے پریشان ہو اور..... یہ تو وہی معاملہ نکلا کہ دو کشتیوں کا سوار.....؟“

اجمل خٹک نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو رئیس جلدی سے بولا۔ ”معاملہ دو طرفہ ہے یار.....“

”دو طرفہ.....؟“

”ہاں خٹک!“ وہ تشکر لہجے میں بولا۔ ”ایک طرف تو شہلا کی وجہ سے میں بہت الجھا ہوا ہوں اور دوسری جانب کاروبار بڑی تیزی سے ڈوب رہا ہے.....!“

شہلا، رئیس کی دوسری بیوی کا نام تھا۔ لگ بھگ چھ ماہ پہلے اس نے شہلا سے شادی کی

تھی اور اس کے بعد ہی کاروبار بتدریج ڈاؤن جا رہا تھا۔ رئیس کی پہلی بیوی کا نام فریدہ تھا۔ فریدہ، رئیس کے دو بچوں کی ماں تھی۔ بیٹے عمران کی عمر پندرہ سال اور اس سے چھوٹی بیٹی شازیہ کی عمر کم و بیش دس سال تھی۔ فریدہ اور یہ دونوں بچے جہانگیر روڈ پر رہتے تھے جبکہ رئیس نے شہلا کو بالکل الگ تھلگ رکھا ہوا تھا۔ شہلا سولجر بازار کے ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ رئیس کی توجہ دونوں گھروں پر برابر ہی تھی تاہم زیادہ جھکاؤ اس کا شہلا کی جانب تھا۔ اس نے ہفتے میں دن مقرر کر رکھے تھے کہ کب وہ شہلا کے ساتھ رات گزارے گا اور کب فریدہ کے ہمراہ۔ دونوں بیویاں اپنی اپنی جگہ اس کی اس روٹین سے مطمئن تھیں یا نہیں البتہ، رئیس دوسری شادی کے بعد مستقل ایک پھیر میں آیا ہوا تھا۔ ہر آنے والا دن پچھلے دن سے زیادہ خراب جا رہا تھا۔

خنک نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں، جب سے تم نے دوسری شادی کی ہے، مسائل نے تمہارے ساتھ دوستی کاٹھ لی ہے۔ کیا تم نے اپنے کرائس کی وجوہ پر غور نہیں کیا.....؟“

”غور کیا بھی ہے اور کرایا بھی ہے۔“ رئیس نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”اور میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں جو تمہارا خیال ہے.....“

خنک ایک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ درحقیقت رئیس کی بات کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ ان لمحات میں رئیس حد سے زیادہ متذبذب اور الجھن زدہ نظر آتا تھا۔ اجمل نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے صبح ناشتا تو کیا ہے نا.....؟“

”ہاں..... ناشتا تو میں کر کے ہی گھر سے نکلا ہوں۔“ رئیس نے جواب دیا۔

اجمل نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنے ایک ملازم کو آفس میں بلا کر چائے اور ٹیک لائے کا حکم دیا پھر رئیس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوا۔ ”یا رئیس! سچ پوچھو تو تمہاری بات میری پلے نہیں پڑی.....!“

رئیس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

”یہی کہ..... تم نے اپنے حالات پر غور کیا بھی ہے اور کرایا بھی ہے۔“ اجمل نے اسی

کے الفاظ دہرایے۔ ”اور یہ کہ تم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہو جو میرا خیال ہے..... تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہوا؟“

”اچھا..... تو تم اس میں الجھے ہوئے ہو۔“ رئیس نے چوکتے ہوئے کہا۔ ”یار خٹک! میں دراصل کل استادفدا کے پاس گیا تھا.....!“

”کون استادفدا.....؟“ اجمل نے خُرت پوچھا۔

”میرا ایک دوست ہے، استادفدا حسین!“ رئیس نے بتایا۔ ”علم نجوم کا ماہر ہے اور نگیںوں وغیرہ پر بھی اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے کافی پرانے تعلقات ہیں۔ وہ سونے چاندی کی انگوٹھیوں اور پتروں وغیرہ کے لیے میرے پاس آتا رہتا ہے۔“

”یہ پترے کیا ہوتے ہیں؟“ اجمل نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔

”یہ سونے، چاندی اور مختلف نرم دھاتوں کی تختیاں سی ہوتی ہیں۔“ رئیس وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”عامل کامل اور علم نجوم کے ماہر حضرات ان دھاتی پتروں پر مختلف تعویذات اور الواح و طلسمات وغیرہ کندہ کرتے ہیں۔ فدا حسین بھی اسی سلسلے میں میرے پاس آتا رہتا ہے۔ میں نے اپنے حالات کا اس سے ذکر کیا تو اس نے کہا کہ میں اس کی دکان پر آؤں۔ وہ میرا زانچہ وغیرہ بنا کر دیکھے گا کہ کہاں خرابی واقع ہے۔ میں کل اسی غرض سے استاد کے پاس گیا تھا۔“

”پھر استاد نے تمہارا زانچہ بنایا؟“ اجمل نے پوچھا۔

”استادفدا نے تین زانچے بنائے ہیں۔“ رئیس نے بتایا۔

”تین.....!“ اجمل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کس کس کے زانچے؟“

”ایک زانچہ میرا.....“ رئیس نے جواب دیا۔ ”دوسرا شہلا کا اور تیسرا ہماری شادی کا،

یعنی میرے اور شہلا کے نکاح کا زانچہ۔“

”پھر ان تینوں زانچوں سے استاد نے کیا نتیجہ برآمد کیا؟“ اجمل نے پوچھا۔

”وہی..... جو تمہارا خیال ہے خٹک!“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”یار..... پہیلیاں نہ سمجھو!“ اجمل نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”استادفدا نے بھی وہی کہا ہے

جو تمہارا خیال ہے، یعنی میرے تمام تر مسائل کا سبب شہلا ہے..... تم نے کہا ہے نا کہ جب سے میں

نے دوسری شادی کی ہے، مسائل نے میرے ساتھ دوستی گانٹھ لی ہے..... کہا ہے کہ نہیں؟“

”دیکھو یار! میں کوئی نجومی یا کوئی پہنچی ہوئی شخصیت نہیں ہوں۔“ اجمل نے گہری سنجیدگی

سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو بس، رواروی میں ایسے ہی تمہاری دوسری شادی کا ذکر کر دیا تھا اور تم.....“

”لیکن استاد فدا نے رواروی میں کچھ نہیں کہا۔“ رئیس قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

”اس نے بڑے ٹھوس اور واضح الفاظ میں پیش گوئی کی ہے۔“

”کیسی پیش گوئی؟“ اجمل متعجب نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

”استاد نے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ میں نے صحیح وقت پر شادی نہیں کی۔“ رئیس نے

بتایا۔ ”مجھے یا تو ایک سال پہلے شادی کر لینا چاہیے تھی یا پھر تین سال کے بعد ایسا قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ اس نے شہلا کو ٹھوس تو نہیں کہا لیکن بڑے ٹھوس انداز میں مجھ پر یہ واضح کر دیا ہے کہ مجھے دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا!“

”دو میں سے ایک کا انتخاب.....!“ اجمل نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف

دیکھا۔ ”کیا استاد کی، دو سے مراد شہلا اور فریدہ ہیں؟“

”نہیں یار.....“ رئیس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”دو سے اس کی مراد ہے، شہلا

اور دکانداری۔“

”یہ کیا بات ہوئی یار رئیس؟“ اجمل نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں خٹک! یہی بات ہے۔“ رئیس ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”استاد نے دو ٹوک انداز میں فتویٰ دے دیا ہے کہ دوسری شادی اور دکانداری ایک ساتھ نہیں چل

سکیں گے۔ مجھے دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہوگا۔ یہ مشکل وقت مجھ پر مزید ڈھائی سال تک

رہے گا۔ کل تین سال کا بیڈ پیچ ہے جس میں سے چھ ماہ گزر گئے ہیں، ڈھائی سال باقی ہیں۔“

”یہ بڑی عجیب بات بتائی ہے استاد نے۔“ اجمل نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

”عجیب بھی اور سولہ آنے کی بھی.....“ رئیس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے

کہا۔ ”آپ خود دیکھ لو خٹک..... میری دوسری شادی کو لگ بھگ چھ ماہ ہو گئے ہیں اور کم و بیش اتنا ہی

عرصہ دکانداری کے زوال کا بھی ہے۔ دھندے کو دیکھ کر لگتا ہے، گا ہک مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ ہر

نیا دن، گزرے ہوئے دن سے زیادہ خراب ثابت ہو رہا ہے۔ اگر یہی صورت حال مزید کچھ عرصہ

بحال رہی تو دکان پر مجبوراً تالا ڈالنا ہی ہوگا۔“

اسی لمحے ملازم لڑکا چائے اور کیک لے کر آ گیا چنانچہ وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اجمل خٹک نے رئیس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”رئیس! کیا تم نے استاد دفا کی پیش گوئی کو دل و جان سے قبول کر لیا ہے؟“

”ہاں..... اس کی بات عقلاً اور عملاً درست ثابت ہو رہی ہے۔“

”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ اجمل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”دونوں

میں سے کس کو چھوڑ رہے ہو؟“

”دونوں“ سے اجمل کی واضح مراد شہلا اور کاروبار تھی۔ رئیس نے بڑے مضبوط انداز

میں کہا۔ ”فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے لیکن تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے اسی لئے میں تم سے ملنے

آیا ہوں۔“

”میں ہر مشورے کے لیے حاضر ہوں یا ر!“ اجمل فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے

بولا۔ ”لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے فیصلہ کیا کیا ہے۔ تمہارا پراسرار انداز میرے اندر تجسس پیدا کر رہا

ہے۔“

”میں نے شہلا کے حق میں فیصلہ کیا ہے!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”گو کیا تم نے دکان پر تالا لگانے کا ذہن بنالیا ہے.....؟“

”بالکل ٹھیک سمجھ!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اب تم مجھے مشورہ دو کہ

مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھ سکتا۔ آخر کو گھربار والا ہوں۔“

”اور وہ بھی دو دو گھر.....!“ اجمل نے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔ ”لوگوں

کے لیے تو ایک گھر کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہوتا ہے۔“

”جہاں گھر روڈ والا گھر تو میری ذاتی ملکیت ہے۔“ رئیس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

”لیکن تم جانتے ہو، سولجر بازار والے جس فلیٹ میں، میں نے شہلا کو رکھا ہوا ہے وہ کرایے کا ہے۔

اگر میں اپنی دکان کو لپیٹ دیتا ہوں تو خود سوچو، میرا گزارہ کیسے ہوگا؟“

اجمل گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”یا رئیس! مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، تمہارے

استاد دفا نے کاروبار کے حوالے سے کن الفاظ میں پیش گوئی کی ہے.....؟“

”استاد نے بڑے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ میں نے بہت غلط وقت پر شہلا سے شادی

کی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”تین سال کا عرصہ مجھ پر بھاری ہے۔ مجھے یا تو ایک سال پہلے شادی کر لینا چاہیے تھی یا پھر تین سال بعد کرتا۔ خیر شادی تو اب ہو چکی۔ استاد کی پیش گوئی چھ ماہ بعد سامنے آئی ہے۔ استاد کا فرمانا یہ ہے کہ اگر شہلا بیوی کی حیثیت سے میرے ساتھ رہتی ہے تو ان تین سال میں، میں جو بھی کام کروں گا وہ بری طرح تباہ ہو جائے گا۔ یہ تین سال میرے لیے فنانشل کرائس کے ہیں جن میں سے چھ ماہ گزر گئے ہیں اور ڈھائی سال باقی ہیں.....“ اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”یار خنک! اگر میں شہلا سے شادی سے لے کر اب تک کے چھ ماہ پر نگاہ ڈالوں تو استاد کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست نظر آتی ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی ہے کہ آگے بھی وہی ہوگا جیسا کہ استاد نے بتایا ہے.....!“

”اگر تم نے استاد خدا کے الفاظ کو دل و دماغ پر نقش کر لیا ہے تو پھر نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارے ساتھ وہی ہوگا جس کی تم توقع کر رہے ہو۔“ اجمل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”بہر حال..... تم میرے ایک بہت اچھے دوست ہو۔ بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”میں نے اپنے موجودہ حالات سے تمہیں تفصیلاً آگاہ کر دیا ہے۔“ رئیس نے چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے مشورہ دو کہ اس پتھویشن میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”ایک بات تو طے ہے رئیس.....!“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”استاد خدا کی پیش گوئی کی روشنی میں تم نے اپنا جو ذہن بنالیا ہے اس کے ساتھ تم جس کام میں بھی ہاتھ ڈالو گے، تمہیں نقصان ہی اٹھانا پڑے گا۔ تمہارا جیولری کا کاروبار بری طرح تباہ ہو رہا ہے۔ یہ دکان بند کر کے تم کوئی اور دھند شروع کرتے ہو تو مخصوص ذہن اور سوچ کے ساتھ نئے دھندے میں بھی تم قدم جما نہیں پاؤ گے لہذا میری نظر میں تو صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے۔“

”کون سا راستہ؟“ اجمل کی بات ختم ہوتے ہی رئیس نے سوال کرویا۔

”محفوظ انویسٹمنٹ!“ اجمل نے کہا۔

”میرے ذہن میں بھی کچھ ایسی ہی سوچ ہے۔“ رئیس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”میں نے اس سلسلے میں استاد سے بھی پوچھا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر میرا سرمایہ کسی اور شخص کے استعمال میں رہے گا تو پھر نقصان کا اندیشہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈھائی تین سال کے لیے اپنا

کل سرمایہ کسی کے کام میں لگا دوں اور آرام سے بیٹھ جاؤں مگر سمجھ میں نہیں آ رہا، ایسی ایماندار پارٹی کہاں تلاش کروں جو میرے سرمایے کے ساتھ اور میرے ساتھ کوئی چار سو بیسی نہ کرے۔ تم تو جانتے ہی ہو خٹک..... کہ آج کل ہر کام میں کس قدر دھوکا اور فراڈ ہو رہا ہے!“

”ہوں..... یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو یا ر!“ اجمل نے اثبات میں گردن ہلائی پھر مشورہ کیا۔ ”رئیس! تم اپنی رقم کو بینک میں دو یا تین سال کے لیے فکس کیوں نہیں کر دیتے۔ اس رقم پر تمہیں ہر ماہ معقول منافع ملتا رہے گا اور سرمایہ بھی محفوظ رہے گا.....“

”نہیں..... بالکل نہیں!“ رئیس کے انکار میں قطعیت تھی۔

”وجہ؟“ اجمل نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ فکس ڈیپازٹ کی رقم ہر طرح سے محفوظ رہے گی لیکن میرے انکار کی دو بڑی وجوہات ہیں۔“ رئیس گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”نمبر ایک..... بینک کا پرافٹ مارجن بہت کم ہوتا ہے، اس میں میرے دونوں گھر نہیں چل سکیں گے۔ نمبر دو..... میں بینک سے حاصل ہونے والے منافع کو ٹھیک نہیں سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ سیدھا سیدھا سود ہوگا جو ہرگز جائز نہیں ہے.....!“

”ہاں یا ر..... یہ ایک مسئلہ تو بہر حال ہے۔“ اجمل گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم اس انداز میں سوچتے ہو تو پھر بینک میں رقم رکھ کر منافع لینا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟“ رئیس نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں غلط اور صحیح کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا یا ر!“ اجمل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”ہر انسان اپنے ذہن اور انداز سے سوچتا ہے۔ کچھ لوگ بینک سے حاصل ہونے والے منافع کو جائز سمجھتے ہیں اور کچھ ناجائز، بہر حال.....“ وہ لمبے بھر کے لیے ٹھہرا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم بینک میں رقم رکھ کر منافع حاصل کرنے کو ٹھیک نہیں سمجھتے تو پھر تمہیں یہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ تمہارے لیے مناسب یہی ہوگا کہ کسی ساکھ والے، ایماندار شخص کے چلتے ہوئے بزنس میں اپنی رقم انویسٹ کر دو اور ”پرافٹ لاس“ کی بنیاد پر اس کے ساتھ پارٹنرشپ کر لو۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ رئیس نے جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”اور اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ مجھے کسی ایسے کھرے اور ایماندار بزنس مین کے بارے میں بتاؤ جہاں

سرمایہ کاری سے میری رقم بھی محفوظ رہے اور مجھے جائز منافع بھی ملتا رہے۔“
 ”ہوں.....!“ اجمل گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”تم کتنی انویسٹمنٹ کر سکتے ہو؟“

”اگر میں اپنی صدر والی دکان اور اس کے اندر موجود تمام تر مال کو فروخت کر دوں اور اس کے اندر ”کیش ان ہینڈ“ کو بھی شامل کر لوں تو کم از کم پچیس لاکھ روپے نکل آئیں گے۔“ رئیس نے مختاط اندازے کے مطابق بتایا۔

”یہ اچھا خاصا اور ہینڈسم اماؤنٹ ہے۔“ اجمل نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پر تمہیں اتنا منافع ضرور مل جائے گا جو تمہاری ضروریات کو پورا کرنے کے بعد سیونگ کے لیے بھی بچ جائے لیکن ایسی ہیوی انویسٹمنٹ بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔“
 ”یار! میں اسی لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔“ رئیس نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اگر میرا دماغ کام کر رہا ہو تا تو پھر تم سے کیوں پوچھتا.....؟“

”گویا تمہاری نظر میں ایسا کوئی بزنس مین نہیں ہے؟“
 ”نہیں..... مجھے کسی پر بھروسہ نہیں۔“ رئیس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”بزنس مین تو بہت ہیں لیکن مجھے ان پر اعتماد نہیں ہے۔ میں اتنی بھاری رقم کے لیے رسک نہیں لے سکتا۔ تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کہاں رقم انویسٹ کرنا چاہیے؟“

”تم بہت بڑی ذمے داری مجھ پر ڈال رہے ہو رئیس!“
 ”دوست ذمے داریاں اٹھانے کے لیے ہی تو ہوتے ہیں۔“ رئیس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پریشانی کے ان لمحات میں بھی تم میرے کام نہیں آؤ گے تو پھر کب آؤ گے؟“
 ”میں تمہاری مدد سے انکاری نہیں ہوں رئیس۔“ وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ اگر تم نے میرے مشورے پر کہیں رقم لگا دی اور خدا نخواستہ بعد میں کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو پھر.....“

”تو پھر..... کچھ بھی نہیں!“ وہ اجمل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میں اسے اپنا نصیب سمجھ لوں گا۔ مجھے تم پر پورا اعتبار ہے خٹک۔ تم مجھے جو بھی مشورہ دو گے، وہ میری بھلائی کے لیے ہی ہو گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اجمل نے کہا۔ ”مجھے چند دن کا وقت دو۔ میں سوچ کر تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کہاں سرمایہ لگانا چاہیے!“

رئیس مطمئن ہو کر اجمل کے آفس سے واپس آ گیا۔

اس کے جانے کے بعد اجمل خٹک کافی دیر تک اپنے اس دوست کے بارے ہی میں سوچتا رہا۔ وہ بہ ذاتِ خود ستاروں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں، انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت صرف دو چیزوں کی ہوتی ہے۔ اول، وقت۔ دوم، محنت۔ وہ وقت اور محنت پر ایمان کی حد تک یقین رکھتا تھا۔ زندگی کے تجربے نے اسے یہی سبق سکھایا تھا کہ اگر انسان وقت ضائع کیے بغیر خلوص نیت کے ساتھ محنت کرے تو اس کی قسمت خود بہ خود ہری بھری ہو جاتی ہے۔ مقدر کو بنانا اور بگاڑنا انسان کے اختیار میں ہے۔ اس نے زندگی بھر اسی فارمولے کی روشنی میں حرکت کی تھی اور ہر قدم پر کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ سیلف میڈ انسان تھا۔ اس نے حالات اور زندگی کے بہت سے چہرے دیکھ رکھے تھے۔ اس تناظر میں استادِ فدا حسین کی پیش گوئی اور اس حوالے سے رئیس کا خوف اجمل کو بڑا مضحکہ خیز محسوس ہوا تھا لیکن اس نے رئیس پر اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی سخت بات سے رئیس کی دل آزاری ہو۔ رئیس کے ذہن میں استاد کی پیش گوئی کے حوالے سے ایک یقین سا بن گیا تھا اور یہ یقین بہت پختہ تھا لہذا فی الحال اس کی سوچ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں تھی۔ اجمل نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ بعد میں، کسی موزوں موقع پر، وہ اپنے دوست کو طریقے سلیقے سے سبھا دے گا۔

اجمل خٹک نے چند دن کے لیے سوچنے کی مہلت لی تھی اور انہی چند دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ رئیس کے لیے کسی ایماندار پارٹی کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ یہ واقعہ اجمل کے لیے کسی ٹریجڈی سے کم نہیں تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ انہی دنوں اجمل کی چھوٹی بہن ثوبیہ خٹک کی شادی کے معاملات اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکے تھے۔ ثوبیہ، اجمل کے پاس ہی رہتی تھی۔ جب ثوبیہ کی رخصتی میں ایک ہفتہ رہ گیا تو اس پر کاروبار کا بہت زیادہ پریشر آ گیا۔ ایمر جنسی میں چند ایسے آرڈر مل گئے کہ جنہیں پورا کرنے کے لئے اجمل کا فوراً سنگاپور جانا ضروری ہو گیا لیکن گھر میں اس کی مصروفیات کچھ اس نوعیت کی تھیں کہ وہ مل نہیں سکتا تھا۔ اس نازک موقع پر اس نے اپنے ایک دوست سے

تعاون کی درخواست کی۔ مذکورہ دوست کا نام ارشد وارثی تھا اور وہ الیکٹرونکس کے بارے میں بھی اچھی خاصی معلومات رکھتا تھا۔ وہ کام کے سلسلے میں کئی بار ملک سے باہر بھی جا چکا تھا۔

اجمل نے اپنے دوست سے ملاقات کی اور کہا۔ ”یار وارثی! تم جانتے ہو، میں چھوٹی بہن کی شادی میں کس قدر الجھا ہوا ہوں۔ میں نے توبیہ کو ماں اور باپ بن کر پالا ہے لہذا اس موقع پر میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میری جگہ تم تین دن کے لیے سنگاپور چلے جاؤ، میرے نمائندے کے طور پر۔ سنگاپور تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ تمہیں وہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”سنگاپور بھلا ہے ہی کتنا سا۔“ ارشد وارثی بے پروائی سے بولا۔ ”اپنے کراچی کو چیریں تو اس میں سے چار سنگاپور نکل آئیں گے۔ بہر حال..... بتاؤ، کام کیا ہے؟“

”وہاں کی الیکٹرونکس مارکیٹ میں سے کچھ مال خریدنا ہے۔“ اجمل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں مال کی فہرست بنا کر دے دوں گا اور یہ بھی بتا دوں گا کہ کون سا آئٹم کس دکان سے ملے گا۔ تمہیں وہ چیزیں خریدنا ہیں اور واپس آ جانا ہے۔ یہ تین سے چار دن کا ٹور ہے۔ تمہارے آنے جانے کا ٹکٹ میں ارنیج کر دیتا ہوں اور وہاں کا کھانا پینا اور رہائش وغیرہ بھی میرے ذمے ہوگی۔“

”کیا یہ سامان مجھے اپنے ساتھ لے کر آنا ہوگا؟“ ارشد نے سوال کیا۔

”یہ سامان دو قسم کا ہے۔“ اجمل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ تو بہت چھوٹے چھوٹے آئٹم ہیں جو تم ”ہینڈ کیری“ میں رکھ کر لاؤ گے۔ یہ بہت قیمتی پرزے ہیں۔ باقی کے آئٹمز وہاں سے میرے آفس کے ایڈریس پر بک ہو جائیں گی اور اس بکنگ کے لیے بھی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کے دکانداروں سے میری سیٹنگ ہے۔ یہ ان کا درد سر ہے۔ میں ان سے فون پر بات کر لوں گا۔ تمہیں بس پے منٹ کر کے رسید حاصل کرنا ہوگی۔ باقی کا کام وہاں کے دکاندار خود کریں گے۔“

”اور الیکٹرونکس کے جو پرزہ جات مجھے ہینڈ کیری میں لانا ہیں، ان میں کوئی ایسی چیز تو

نہیں کہ خدا خواستہ میں.....“

”ارے نہیں یا! تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔“ اجمل نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”تم فکر

نہ کرو۔ اس میں کسی قسم کا رسک نہیں۔ تمہارے پاس ایک ایک آئٹم کی خریداری کی رسید ہوگی۔ تم

سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا جائے گا۔“

ارشاد وارثی نے کام کی ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ روانگی کب ہے؟“

”دو دن بعد تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔“ اجمل خٹک نے جواباً بتایا۔ ”تم اپنا پاسپورٹ وغیرہ آج ہی مجھے دے دو تا کہ میں ٹکٹ وغیرہ کے معاملات کو نمٹا دوں۔“

اس زمانے میں تھائی لینڈ، سنگا پور اور چند دیگر جنوب ایشیائی ممالک کے لیے ویزا لینا ضروری نہیں تھا۔ مذکورہ ممالک کے ایئر پورٹ پر ہی انٹری کی اسٹیمپ لگا کر ملک میں داخلے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ یہ ”انٹری“ محدود دنوں کے لیے ہوتی تھی۔ بہر حال، سیر و تفریح کے شائقین اور چھوٹے موٹے بزنس کرنے والوں، بہ شمول کھپس حضرات کے لیے بہت آسانیاں تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں مشکلات اور دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

ارشاد وارثی نے سب سے اہم سوال کیا۔ ”یار اجمل! یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ میں سنگا پور کی الیکٹرونکس مارکیٹ میں خریداری کیسے کروں گا۔ رقم کا کیا بندوبست ہوگا؟“

”میں اپنے ساتھ کبھی کیش لے کر نہیں جاتا ہوں.....!“

”تو کیا وہاں تمہارا ادھار کھاتا چلتا ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں یار!“ اجمل نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ادھار کھاتے والا

سلسلہ ادھر ہی چلتا ہے۔ وہ لوگ تو نقد کے بیوپاری ہیں اور وہ بھی کیش کی صورت.....“

”تو کیا تم ان دکانداروں کو بینک کے ذریعے پیٹنگی ادائی کر دو گے؟“ ارشد نے الجھن

زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”جب وہ ادھار کے عادی نہیں ہیں تو پھر میں خریداری کیسے کروں گا؟“

”سنگا پورین ڈالر ز سے.....!“ اجمل نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ارشاد الجھ کر بولا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں یار.....؟“

یہ ٹھیک ہے کہ ارشد وارثی اس سے پہلے بھی گھومنے پھرنے سنگا پور جا چکا تھا مگر اس نوعیت کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ جیسی وہ کرید کرید کر معلومات حاصل کر رہا تھا۔ اجمل خٹک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”بینک کے ذریعے ایڈوانس ادا کی تو ہو سکتی ہے لیکن بینک چار جز کے معاملے میں کسی قسائی سے کم نہیں۔ اپنا پرافٹ مارجن کم ہو جاتا ہے اور بینک ٹرانسفر کے ذریعے اکم ٹیکس وغیرہ کے الگ معاملات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لہذا میں تو بہت ہی محفوظ راستہ اختیار کرتا ہوں۔“ وہ لمبے بھر کے لیے تھما پھر راز دارانہ لہجے میں بولا۔

”ہنڈی کا راستہ.....!“

”اوہ.....!“ ارشد وارثی ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اجمل اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ”میں یہاں رقم جمع کرا دوں گا۔ ہنڈی کا کام کرنے والے مخصوص کوڈ دیتے ہیں۔ میں جس ”کمپنی“ سے ہنڈی کراتا ہوں ان کی پوری دنیا کے بڑے شہروں میں برانچیں ہیں۔ تم سنگاپور میں ان کی برانچ میں جا کر مخصوص کوڈ کے ساتھ اپنی شناخت کراؤ گے تو وہ تمہیں سنگاپورین ڈالرز میں رقم ادا کر دیں گے۔“

”رقم کتنی ہوگی؟“ ارشد وارثی نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”پاکستانی بیس لاکھ ہیں۔“ اجمل نے جواب دیا۔ ”ان کے سنگاپورین ڈالرز کتنے بنیں گے، یہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ جس دن تم یہاں سے روانہ ہو گے، اسی روز میں یہ بیس لاکھ روپے ہنڈی کراؤں گا۔“

”یار اجمل! یہ خاصا بڑا ماؤنٹ نہیں ہے!“ ارشد کے انداز میں تذبذب تھا۔

”ہاں.....!“ اجمل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اسی لیے تو تمہیں بھیج رہا ہوں۔“

مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ اصل میں، اس بار مجھے ایک بہت بڑا آرڈر مل گیا ہے جسے بروقت پورا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس پر میرے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ یہ ایک طرح کا ٹیسٹ کیس بھی ہے۔ اگر میں نے مقررہ وقت پر سپلائی دے دی تو مجھے پی اے ایف سے بھی کام ملنا شروع ہو جائے گا۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔“

”پی اے ایف.....!“ ارشد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ

پاکستان ایئر فورس؟“

”بالکل یہی مطلب ہے۔“ اجمل نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”شاید تمہارے علم میں نہ

ہو کہ فورس کے لوگوں کو اوپن مارکیٹ سے اس نوعیت کی خریداری کی اجازت نہیں ہوتی۔ انہیں اپنی

ضرورت کے لیے کسی بھی قسم کے پرزہ جات کی خریداری پرائیویٹ سپلائرز سے کرنا ہوتی ہے جس کا
 اقاعدہ حساب اور ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ میں تمہارے ذریعے سنگاپور سے جو اسپئر پارٹس اور پرزہ
 جات وغیرہ منگوا رہا ہوں اس الیکٹرونکس میں کم وبیش آدھا مال ”پی اے ایف“ والوں کا ہے۔ اگر
 میں ٹوبیہ کی شادی میں مصروف نہ ہوتا تو پھر اس کام کے لیے تمہیں ہرگز زحمت نہ دیتا۔ یہ آرڈر بھی
 اچانک ہی ملا ہے نا۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ میں شادی کو نمٹانے کے بعد بڑے آرام سے سنگاپور روانہ
 ہوں۔ اکمل بھی شادی ہی کے ہنگاموں میں الجھا ہوا ہے، پھر اس نے نیا نیارےٹورنٹ کھولا ہے۔
 اسے بھی وقت دینا بہت ضروری ہے اور.....“

”یار! اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں!“ ارشد وارثی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔
 میں تمہارا یہ کام بڑے اچھے طریقے سے اور بروقت کر ڈالوں گا.....“
 ”تمہارا بہت بہت شکریہ یار!“ اجمل نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔
 ارشد بولا۔ ”اب تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو!“

انہوں نے گرم جوش مصافحہ کیا پھر ارشد وارثی رخصت ہو گیا۔
 جس روز ارشد کو سنگاپور کے لیے فلائی کرنا تھا، اجمل خٹک نے مبلغ بیس لاکھ روپے ہنڈی
 کرادیئے اور مخصوص کوڈ کے ساتھ ہی ارشد وارثی کو ضروری ہدایات بھی دے دیں تاکہ اسے وہاں
 کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

ارشد وارثی سنگاپور روانہ ہو گیا.....!
 اجمل خٹک شادی کے ہنگاموں میں مصروف ہو گیا.....!
 شادی منٹ گئی۔ ٹوبیہ بیاہ کر اپنی سسرال چلی گئی.....!
 ارشد وارثی کی واپسی کا وقت آن پہنچا..... لیکن وہ لوٹ کر نہیں آیا، اجمل خٹک کے
 ہاتھ پاؤں پھول گئے.....!

اس نے سب سے پہلے ہنڈی والوں سے رابطہ کیا۔ پتا چلا کہ سنگاپور میں حسب پروگرام
 ارشد وارثی نے مذکورہ رقم سنگاپورین ڈالرز میں وصول کر لی تھی۔ اجمل نے متعلقہ دکانداروں سے
 ٹیلی فون رابطے کیے۔ معلوم ہوا کہ اس کے لیے کسی قسم کی کوئی خریداری نہیں کی گئی اور نہ ہی کوئی آرڈر
 بک کرایا گیا ہے۔ یہ بات تو طے تھی کہ ارشد بخیر و عافیت سنگاپور پہنچا تھا اور اس نے ہنڈی والوں

کے آفس جا کر رقم وصول کی تھی۔ اس کے بعد وہ کہاں غائب ہو گیا تھا، اس حوالے سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

اجمل کی چھٹی حس چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ..... بیٹا! تمہارے ساتھ فراڈ ہو گیا ہے۔ ارشد وارثی اب کبھی واپس نہیں آئے گا.....!

لیکن اس کا دل ارشد کو دھوکے باز ماننے کو تیار نہیں تھا۔ دل کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ وہاں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے یا وہ کسی ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے کہ نہ تو اس سے رابطہ کر پارہا ہے اور نہ ہی مارکیٹ تک جاسکا ہے۔ اس نے سنگاپور میں موجود اپنے واقف دکانداروں سے ارشد وارثی کی پراسرار گمشدگی کا سراغ لگانے کے لیے منت خوشامد کی مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اس نے کراچی میں ارشد کے گھر والوں سے رابطہ کیا۔ پتا نہیں، یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ پریشانی میں انسان اپنی رسائی کے سب سے زیادہ تیز رفتار گھوڑے کو پہلے دوڑاتا ہے۔ بہر حال، ارشد کے گھر والوں کا جواب انتہائی مایوس کن تھا۔

انہوں نے اجمل کو بتایا کہ وہ دہلی کی طرف نکل گیا ہے۔ ارشد کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور اس پر امریکا جانے کا بھوت بھی سوار تھا۔ اسی سلسلے میں وہ دو تین ناکام..... کوششیں بھی کر چکا تھا۔ گھر والوں کو وہ یہی راگ سن کر گیا تھا کہ اس کے ایک دوست نے دہلی بلایا ہے اور یقین دلایا ہے کہ دہلی میں رہتے ہوئے اگر امریکا جانے کی ٹرائی کی جائے تو کامیابی کے زیادہ امکانات ہیں۔ ارشد وارثی اپنے گھر والوں کو یہ بھی بتا کر گیا تھا کہ جب اس کا امریکا کا ویزا لگ جائے گا تو وہ انہیں مطلع کر دے گا، گویا..... اس کی واپسی کا مستقبل قریب میں کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اجمل کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ دہلی کی بہ نسبت، سنگاپور سے امریکا جانے کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ ارشد کے گھر والوں سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ اجمل خٹک کے ساتھ ایک کھلم کھلا فراڈ ہو گیا تھا۔ ارشد دہلی سے امریکا جانے کی کوشش کر رہا تھا یا سنگاپور سے، اس سے کوئی فرق البتہ نہیں پڑتا تھا!

اجمل نے ارشد کے والد ارشد وارثی کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”انکل! آپ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں.....!“ ارشد وارثی نے ٹکاسا جواب دیا۔

”انکل! یہ بیس روپے نہیں..... بیس لاکھ روپے کا معاملہ ہے۔“ اجمل نے شپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور آپ بڑے آرام سے کہہ رہے ہیں..... کچھ بھی نہیں.....؟“

”تو کیا کہوں؟“ راشد وارثی اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرے علم میں تو نہیں کہ تم نے ارشد کو اتنی بڑی رقم دی تھی۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرا بیٹا دبی گیا ہے.....“

اجمل کا خون کھول کر رہ گیا، وہ درشت لہجے میں بولا۔ ”انکل! آپ زیادتی کر رہے ہیں!“

”زیادتی میں نہیں، تم کر رہے ہو برخودار.....!“ راشد وارثی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”تم میرے بیٹے پر سراسر الزام لگا رہے ہو۔ کیا تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے کہ ارشد نے تم سے بیس لاکھ روپے لیے ہیں؟“

”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کس طرح ہنڈی کے ذریعے بیس لاکھ روپے سنگا پور ٹرانسفر کیے گئے تھے۔“ اجمل نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ارشد نے سنگا پور پہنچ کر رقم وصول کی ہے۔ اس کے بعد وہ غائب ہوا ہے.....!“

”تم نے مجھ سے پوچھ کر نہ مجھے بتا کر اور نہ ہی میرے سامنے ارشد کو کوئی رقم دی ہے۔“ راشد وارثی نے بڑی رکھائی سے کہا۔ ”تم چاہو تو ارشد پر کیس کر دو.....“

راشد وارثی کے رویے سے ظاہر تھا کہ اس کے بیٹے نے اجمل کے ساتھ جو فراڈ کیا ہے، وہ اس کے بارے میں سن گن ضرور رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے بیٹے کے دوست یعنی اجمل سے چند باتیں ہمدردی کی ضرور کرتا۔ جہاں تک ارشد وارثی پر دھوکا دہی کے کیس کا تعلق تھا تو عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ سنگا پور میں ارشد وارثی نے رقم وصول کی تھی، اس کا واحد ثبوت وہ ہنڈی کا بزنس کرنے والے لوگ تھے لیکن اس ثبوت کو عدالت میں پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔ ہنڈی کا کاروبار انتہائی ایماندارانہ مگر غیر قانونی ہوتا ہے لہذا وہ کسی قسم کی گواہی کے لیے سامنے نہیں آتے۔

اتمام حجت کے طور پر اجمل نے ارشد وارثی کے باپ سے پوچھا۔ ”آپ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ دبی میں کس کے پاس گیا ہے۔ اس کے دبی والے دوست کا پتا ٹھکانا اور فون نمبر وغیرہ دے دیں۔“

”ابھی تو ایسی کوئی بھی چیز میرے پاس نہیں ہے۔“ راشد وارثی بہ دستور بے مروتی سے

ہوا۔ ”ارشد نے جانے کے بعد سے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں کیا۔ اگر اس کا فون آیا تو میں اس سے پوچھ لوں گا۔ فی الحال، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا.....“

ارشد وارثی کے ساتھ الجھنے سے فوری طور پر کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے عقل مندی کا فیصلہ کیا اور کوئی بد مزگی پیدا کئے بغیر واپس آ گیا۔ اس وقت اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنی ساکھ بچانے کا تھا۔ آرڈرز کی سپلائی کا مرحلہ سر پر آن پہنچا تھا۔ وہ کوئی بھی معقول سا بہانہ کر کے ایک دو روز کی تاخیر کی مہلت حاصل کر سکتا تھا۔ چھوٹی بہن کی شادی کو نہایت ہی موزوں وجہ تاخیر بنایا جا سکتا تھا۔ ارشد وارثی فی الحال ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس کی تلاش یا اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کو بعد میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ فی الحال، فی الفور سنگا پور روانہ ہونے کی ضرورت تھی لیکن اس کام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رقم تھی.....!“

اس کے پاس جو جمع پونجی تھی وہ اس نے ثوبیہ کی شادی میں خرچ کر ڈالی تھی، پھر بیس لاکھ ہنڈی کرانے کے بعد تو اس کے تمام اکاؤنٹس خالی ہو گئے۔ اکمل خٹک نے نیا نیار یسٹورنٹ کھولا تھا۔ اس کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ پریشانی کے انہی لمحات میں اس کے تصور میں، دو بیویوں کے شوہر رئیس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بوجھل سینے سے ایک اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔

رئیس اپنے حالات سے تنگ آ کر پچیس لاکھ کی خطیر رقم کسی محفوظ اور منافع بخش بزنس میں لگانا چاہتا تھا اور اجمل خٹک کو فوری طور پر بیس پچیس لاکھ روپے کی اشد ضرورت تھی۔

دونوں دوستوں نے ایک نہایت ہی اہم میٹنگ کی جس میں اجمل خٹک نے رئیس کو اپنے تازہ ترین حالات اور ہنگامی ضرورت کے بارے میں بتایا۔ رئیس، اجمل کے بزنس میں پچیس لاکھ روپے لگانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ٹرمز اینڈ کنڈیشنز طے کرنے کا وقت نہیں تھا۔ رئیس نے پورے بھروسے کے ساتھ رقم اجمل خٹک کے حوالے کی اور بڑے واضح الفاظ میں کہا۔

”یار خٹک! تم فوراً سنگا پور روانہ ہو جاؤ۔ پہلے اپنی امیر جنسی نمشاؤ۔ باقی کی باتیں بعد میں آرام سے بیٹھ کر طے کر لیں گے.....!“

اجمل خٹک سنگا پور روانہ ہو گیا۔

روانگی سے قبل اس نے بیس لاکھ روپے ہنڈی کے ذریعے وہاں پہنچوا دیے۔

پانچ لاکھ اس نے اپنے اکاؤنٹ میں چھوڑ دیے کہ بعد میں ضرورت پیش آئے گی۔
وہ کامیابی سے سنگاپور کا دورہ کر کے واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ بیس لاکھ روپے کا جو
فراڈ ہوا تھا اس کی خبر صرف رئیس کو تھی اور اس نے رئیس کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس معاملے کو
عام نہ کیا جائے حالانکہ رئیس نے تو اسے ایک جلالی مشورہ بھی دیا تھا۔

”یار خٹک! اپنے جاننے والوں میں ایک دو پھدے باز قسم کے لوگ بھی ہیں جن کی تمام
کی تمام انگلیاں ٹیڑھی ہیں۔ وہ اس برتن میں سے بڑی آسانی سے کھی نکال لیں گے۔ اگر تم کہو تو
میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”جانے دو یار! میں کسی قسم کی پھدے بازی میں نہیں پڑنا چاہتا۔“ اجمل خٹک نے
اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”یار خٹک! بیس لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی.....!“

”ہاں..... میں جانتا ہوں.....“

”پھر بھی.....؟“ رئیس کی حیرت سوا ہو گئی۔

”میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے.....!“ اجمل نے پراعتقاد لہجے میں کہا۔ ”وہاں

سے جو بھی فیصلہ آئے گا، مجھے منظور ہے.....“

رئیس بے یقینی اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ یک ٹک خٹک کو دیکھتا چلا گیا۔

خٹک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”رئیس! میری ایک بات ذہن میں بٹھالو۔ جو لوگ کسی سے فراڈ کرتے ہیں یا کسی کے

خلاف سازش بنتے ہیں وہ درحقیقت اس کی راہ کے کانٹے جن رہے ہوتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے کے

بعد وہ شخص تو ترقی کے راستے پر آگے بڑھ جاتا ہے اور سازشی اور دھوکے باز شخص انہی کانٹوں میں

الجھ کر اپنی زندگی لہو لہان کر لیتا ہے.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی

پھر ٹھوس انداز میں گویا ہوا۔

”تم دیکھ لینا رئیس! میرے بیس لاکھ ارشد وارثی کو آسانی سے ہضم نہیں ہوں گے اور

میرا خدا..... کسی نہ کسی راستے سے یہ نقصان پورا کر دے گا۔“

اللہ کی ذات اور اس کے نافذ کردہ قانون پر ایسا غیر متزلزل یقین دیکھ لینے کے بعد رئیس

کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اسی روز انہوں نے شراکتی بزنس کے قواعد و ضوابط بھی طے کر لیے۔

اس وقت اجمل کے چلتے ہوئے بزنس کی کل مالیت لگ بھگ پچھتر لاکھ روپے تھی۔ رئیس نے اسے پچیس لاکھ دیے تھے لہذا وہ ایک چوتھائی کاروبار کا ”سلیپنگ پارٹنر“ بن گیا۔ انہوں نے نفع اور نقصان کے حوالے سے بھی معاملات طے کر لیے۔ دونوں میں تمام امور پر اتفاق رائے ہو گیا۔

انہیں یہ پارٹنرشپ بزنس چلاتے ہوئے کم و بیش ایک سال کا عرصہ گزرا تھا کہ ایک روز اجمل خٹک کو اپنے بزنس پارٹنر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

اس کیس کے حوالے سے مجھے اور بھی بہت سی باتیں پتہ چلی تھیں لیکن اس تفصیل کو بیان کرتے ہوئے میں نے ان کا ذکر گول کر دیا ہے تاکہ کہانی کا سسپنس برقرار رہے۔ مذکورہ نقاط کے بارے میں عدالتی کارروائی کے دوران آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

میں نے ملزم اجمل خٹک کی بیوی زریںہ بیگم سے اپنی فیس وصول کر کے رسید بنادی اور انہیں تسلی دی کہ گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ اللہ سب معاملات کو درست کر دے گا۔ اکمل خٹک اور زریںہ بیگم مطمئن ہو کر میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔

آئندہ روز میں نے متعلقہ تھانے جا کر اس کیس کے ملزم اجمل خٹک سے بھی ایک بھر پور ملاقات کی اور اسے پولیس کی ”میزبانی“ کے دوران میں جان و مال کی حفاظت کے حوالے سے چند مفید مشورے بھی دیے۔ اجمل بہت ہی سلجھا ہوا اور شائستہ انسان تھا۔ اس کی شخصیت اور گفتگو نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر دستخط لینے کے بعد ارشد وارثی فراڈیا کے سلسلے میں بھی اس سے مختلف سوالات کیے جن کے اس نے ٹو دی پوائنٹ جواب بھی دیے۔ ان میں سے بعض جوابات میرے لیے حیران کن ہونے کے ساتھ ہی دلچسپی کا باعث بھی تھے۔ میں نے اجمل خٹک سے چند ایسے لوگوں کے نام، ایڈریس اور فون نمبرز بھی لے لیے جو کسی نہ کسی حوالے سے اس کی بے گناہی ثابت کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

آئندہ چند روز میں نے مختلف زاویوں اور سمتوں میں بھاگ دوڑ کر کے بہت سی مفید معلومات اکٹھی کر لیں اور مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ اس موقع پر میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت اور دیگر اہم کاغذات بھی دائر کر دیئے پھر اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میرا موکل ایک معزز شہری ہے۔ اس کا پولیس ریکارڈ بالکل صاف اور بے داغ ہے۔ یہ صاف ستھرا کاروبار کرتا ہے اور حکومت پاکستان کو باقاعدہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اس کے کلائنٹس میں بعض ایسے معتبر اور بااثر لوگ ہیں جن کی گواہی اور ضمانت کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس شریف النفس انسان کو ایک گہری سازش کے تحت اس مرڈر کیس میں پھنسا یا گیا ہے لہذا.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئی اپنی بات مکمل کر دی۔

”لہذا معزز عدالت سے میری پرزور اپیل ہے کہ میرے موکل کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے تاکہ اس کی کاروباری ساکھ اور نیک نامی متاثر نہ ہو۔ دیش آل پور آؤ!“

”جناب عالی! یہ ایک قتل کا کیس ہے۔“ وکیل استغاثہ نے درخواست ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”جائے وقوعہ کے بیشتر مقامات پر ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ملزم کو ضمانت پر رہا کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہو گا۔“

”جائے وقوعہ پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات اس لیے پائے گئے ہیں کہ میرا موکل وہاں گیا تھا۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”جب عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہو گا تو میں یہ ثابت کر دوں گا کہ ملزم کو ایک فون کر کے جائے واردات پر بلایا گیا تھا فی الحال، معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت کو قبول کیا جائے۔“

وکیل استغاثہ نے مجھ پر پھر پور چوٹ کرتے ہوئے کہا ”یور آؤ! میرے فاضل دوست جب یہ ثابت کر دیں گے کہ ملزم کو کسی فون کے ذریعے وقوعہ پر بلایا گیا تھا تو جب کی جب دیکھی جائے گی۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ ملزم کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔“

”جناب عالی! میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”جبکہ اس کا پولیس ریکارڈ.....“

”اگر ملزم کا پولیس ریکارڈ پہلے صاف و شفاف رہا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ وہ آئندہ بھی کسی جرم میں ملوث نہیں ہوگا!“ وکیل استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”استغاثہ کے پاس ایسی ٹھوس شہادتیں اور گواہ موجود ہیں جنہیں معزز عدالت میں پیش کرنے سے ملزم کا جرم ثابت ہو جائے گا!“

”اب آپ کیا کہیں گے بیگ صاحب؟“ جج نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا۔ ”جناب عالی! میرے پاس بھی ایسی واقعاتی شہادتیں اور ٹھوس دلائل ہیں جو میرے موکل کو بے گناہ ثابت کر دیں گے۔“

”تو پھر کیس کو چلنے دیا جائے.....!“ وکیل استغاثہ نے جج سے درخواست کی۔ ”آنے والی دو چار پیشیوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا.....!“

وکیل استغاثہ کی تجویز نما استدعا جج کو بے حد پسند آئی اور اس نے ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے احکامات صادر کر دیے۔ اس کے بعد، پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!“

میں پہلے بھی کئی مرتبہ اس امر کی وضاحت کر چکا ہوں کہ قتل کے کیس کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے لہذا وکیل صفائی اپنے موکل کی درخواست ضمانت مسترد ہونے پر زیادہ حیران یا پریشان نہیں ہوا کرتا البتہ، ملزم کے لواحقین کا معاملہ دیگر ہے۔ وہ چونکہ اپنے بندے کی ضمانت پر رہائی کی امید لگائے بیٹھے ہوتے ہیں لہذا انہیں دھچکا لگتا ہے تاہم انہیں سنبھال دینا وکیل صفائی کے فرائض کا حصہ ہے۔

ہم عدالتی کارروائی کے اختتام پر کمرے سے باہر آئے تو برآمدے میں، میرے ساتھ چلتے ہوئے زرینہ بیگم نے کہا۔

”بیگ صاحب! میں تو سمجھ رہی تھی اجمل کو آج رہائی مل جائے گی لیکن.....!“

”آج نہیں تو کل آپ کے شوہر کو انشاء اللہ ضرور رہائی ملے گی..... باعزت رہائی!“
 میں نے اس کے مایوسی بھرے نامکمل جملے کے جواب میں کہا۔ ”آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دراصل.....“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”قتل کے کیس میں پھنسے ہوئے ملزم کی ضمانت کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ عموماً وکیل صفائی کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی اور یہ کوئی غیر معمولی یا حیران کن بات نہیں ہے۔ میں اپنی تیاری سے بالکل مطمئن ہوں اور آپ کو بھی اطمینان رکھنا چاہیے۔“
 ”مرزا صاحب! آپ نے اس کیس کو بڑی تفصیل سے اسٹڈی کیا ہے۔ فرینکلے بتائیں، آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟“

”کامیابی کے روشن امکانات!“ میں نے اکل کو جواب دیا۔ ”مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ میں آپ کے بھائی صاحب کو اس وبال سے بخیر وعافیت نکال لوں گا۔“
 ”اور ایک فیصد کیا امکان ہے؟“ اس نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”میں نے ننانوے فیصد والی بات حفظ ماقدم کے طور پر کی ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ مجھے تو سو فیصد یقین ہے کہ اس کیس میں فتح ہماری ہوگی۔ میں نے عدالتی اکھاڑے میں وکیل استغاثہ سے فائٹ کا جو نقشہ بنایا ہے اس میں اگر کوئی بڑا اور غیر متوقع بحران واقع نہیں ہو جاتا تو یقیناً آپ کے بھائی صاحب باعزت رہائی پا کر گھر جائیں گے۔ دیکھیں نا.....“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک بوجھل سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”سو فیصد تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو کسی بھی حوالے سے کسی کی محتاج نہیں۔ ہم سب تو امکانات کی دنیا میں رہتے ہیں۔ کسی کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے لہذا رسک کو نظر انداز کرنا دانش مندی نہیں، چاہے اس کی شرح اعشاریہ زیور زیور..... ون ہی کیوں نہ مقرر کی جائے!“

”آپ بجا فرما رہے ہیں مرزا صاحب!“ اکل ٹنک اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

بولے۔

”گویا، میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ وہ اپنی بھانج کو بھی اچھی طرح سمجھا دے گا۔“

میں نے انہیں مناسب تسلی دے کر رخصت کیا اور دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے کچھ استغاثہ کے بارے میں بھی بات ہو جائے۔ استغاثہ کے مطابق، ملزم اجمل خٹک نے پچیس لاکھ کی رقم ہڑپ کرنے کے لیے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مقتول نے ملزم کے کاروبار کو سنبھالا دینے کے لیے اسے پچیس لاکھ کی خطیر رقم مہیا کی تھی جس کے لیے باقاعدہ لکھت پڑھت نہیں کی گئی تھی۔ مقتول رئیس نے اپنے دوست یعنی ملزم پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے یہ رقم فراہم کی تھی لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد ملزم کی نیت خراب ہو گئی۔ اس کا بزنس پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے جب مقتول نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو ملزم ”آج کل، آج کل“ کا کہہ کر اسے ٹالنے لگا۔ جب مقتول کا تقاضا حد سے بڑھا تو ملزم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری..... لیکن ملزم کی بد قسمتی کہ جائے وقوعہ پر اس کی آمد اور مبینہ واردات میں اس کے ملوث ہونے کے ٹھوس ثبوت مل گئے تھے لہذا پولیس نے تھوڑی سی تنگ و دو کے بعد ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا تھا۔

واقعات کے مطابق، مقتول نے صدر کے علاقے میں، بوہری بازار کے قریب ایک بلڈنگ میں گپڑی پر ایک فلیٹ خریدا تھا جس میں ابھی رہائش اختیار نہیں کی گئی تھی۔ فلیٹ میں چھوٹا موٹا مرمت کا کام باقی تھا۔ مقتول چند روز بعد اپنی دوسری بیوی شہلا کے ساتھ یہاں شفٹ ہونے والا تھا۔ شہلا کو اس نے سو لجر بازار میں، کرائے کے ایک فلیٹ میں رکھا ہوا تھا۔

واقعہ کی شام مقتول رئیس اپنے فلیٹ کے معائنے کے لیے آیا ہوا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد ملزم بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملزم نے مقتول کے جسم میں دو گولیاں اتار کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔ استغاثہ کے دعوے کے مطابق، انہیں ملزم کے مذکورہ فلیٹ میں آمد و رفت کا ایک عینی شاہد بھی مل گیا تھا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی ایک شہادتیں تھیں جو ملزم کے خلاف جاتی تھیں۔ فلیٹ کے اندر مختلف مقامات پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ پولیس نے خانہ تلاشی کے دوران میں آلہ قتل بھی برآمد کر لیا تھا جو اعشاریہ تین دو کیلی برکا ایک ریوالور تھا۔ استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق، ملزم نے مقتول کے سینے کو نشانہ بناتے ہوئے دو فائر کیے تھے۔ یہ دونوں گولیاں عین دل کے مقام پر لگی تھیں جس سے اس کی موت فوراً واقع ہو گئی تھی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتول

رہیس کی موت دس اکتوبر کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ ایک فوری موت تھی جس کا سبب دل میں گھسنے والی وہ دو مہلک گولیاں تھیں جنہیں اعشاریہ تین دو کے ریوالور سے فائر کیا گیا تھا۔ مقتول پر یہ دونوں فائر بہت نزدیک سے کیے گئے تھے۔ قاتل اور مقتول کے درمیان پانچ چھ فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ اس رپورٹ میں چند ٹیکنیکل باتیں بھی درج تھیں جو کہانی کے اعتبار سے غیر ضروری ہیں لہذا یہاں پر ان کا ذکر مناسب نہیں ہوگا۔



آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم اجمال خٹک نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاشہ کی جانب سے کم و بیش آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن یہاں میں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جو مختلف اعتبار سے اہمیت کے حامل ہوں گے۔ سب سے پہلے ملزم کا حلیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ اجمال خٹک کا بیان مکمل ہوا تو وکیل استغاشہ پندرہ بیس منٹ تک کڑی جرح کے جوہر دکھاتا رہا۔ ملزم نے میری ہدایات کی روشنی میں وکیل مخالف کے سوالات کے جوابات دیے۔ اس موقع پر وہ ایک لمحے کے لیے بھی پریشان یا نروس نہیں ہوا تھا۔ وکیل استغاشہ نے ملزم کو فارغ کیا تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اپنے موکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول نے فون کر کے آپ کو اپنے فلیٹ پر بلایا تھا؟“

”جی ہاں، یہ بات بالکل درست ہے!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کون سے فلیٹ پر؟“ میں نے پوچھا۔ ”بوہری بازار والے یا سو لجر بازار والے؟“

”بوہری بازار والے فلیٹ پر۔“ ملزم نے جواب دیا۔ ”جو اس نے حال ہی میں چٹری پر خریدا ہے۔۔۔۔۔ وہ چند روز بعد وہاں شفٹ ہونے والا تھا کہ۔۔۔۔۔“

ملزم نے افسوس ناک انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ”مقتول نے آپ کو کتنے بجے مذکورہ فلیٹ پر بلایا تھا؟“

”رئیس کا فون لگ بھگ ساڑھے پانچ بجے سہ پہر آیا تھا۔“ ملزم نے جواب دیا۔ ”عام طور پر میں سات بجے تک اپنا آفس بند کر دیتا ہوں۔ یہ میرا معمول ہے۔ اگر کام کی زیادتی ہو تو دوسری بات ہے۔۔۔۔۔“ اس نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

”لہذا میں نے دفتر سے نکلنے کے وقت اپنے ملازمین سے کہہ دیا تھا کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ وہ سات بجے آفس بند کر کے گھر چلے جائیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ رئیس کے پاس کتنا وقت لگ جائے گا چنانچہ میں اس فیصلے کے ساتھ دفتر سے نکلا تھا کہ رئیس کی بات سننے کے بعد میں سیدھا اپنے گھر چلا جاؤں گا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔۔۔۔۔“

”آپ نے ایسا ہی کیا تھا۔۔۔۔۔!“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں دہرایا۔ ”آپ جب آفس سے نکلے تو آپ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ رئیس کے فلیٹ پر کتنا وقت لگے گا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا خشک صاحب؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ عدالتی کارروائی کے دوران میں ملزم کو عموماً آپ جناب سے مخاطب نہیں کیا جاتا۔ خصوصاً وکیل استغاثہ کی جرح کا انداز تو بڑا تحقیر آمیز ہوتا ہے لیکن یہ کوئی عدالتی اصول یا قانونی فارمولا نہیں۔ میں اگر اپنے موکل کو شائستہ لہجے میں مخاطب کر رہا تھا تو اس پر معزز عدالت کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

”کیا مقتول نے فون پر کوئی ایسی بات کی تھی جس سے اندازہ ہو سکے کہ اس نے آپ کو بوہری بازار والے فلیٹ پر کیوں بلایا تھا؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ آواز سے بہت پر جوش لگ رہا تھا۔“ ملزم نے مضبوط لہجے میں بتایا۔ ”اس نے صرف یہ کہا تھا کہ وہ مجھے کوئی سر پرانز دینا چاہتا ہے۔ ایک ایسا سر پرانز جو مجھے خوش کر دے گا۔ اس نے اس سر پرانز کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ بس، اتنا کہا تھا کہ میں فوراً وہاں پہنچوں۔“

”اور آپ فوراً وہاں پہنچ گئے! آپ کتنے بجے مقتول کے فلیٹ پر پہنچے تھے؟“

”میرا خیال ہے، اس وقت سہ پہر کے یا شام کے چھ بجے تھے۔“

”پھر مقتول نے آپ کو سر پرانز دیا۔“

”نہیں!“ وہ قطعیت سے بولا۔

”کمال ہے.....“ میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“
اس موضوع پر میرے اور اجمل خٹک کے درمیان حوالات میں تفصیلی گفتگو ہو چکی تھی
لیکن حقائق کو عدالت کے سامنے پیش کرنے کا ایک اپنا رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ ایک ایک پوائنٹ کو
بڑے اطمینان سے رجسٹر کرانا پڑتا ہے۔ ملزم نے میرے حیرت بھرے استفسار کے جواب میں
بتایا۔

”رئیس فلیٹ میں موجود ہی نہیں تھا.....“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں نے رئیس کے فلیٹ پر پہنچ کر اطلاع گھنٹے بجائی لیکن اندر سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں
ہوا۔“ ملزم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جب دوسری اور تیسری بیل پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو میں
نے غیر ارادی طور پر لٹو گھماتے ہوئے فلیٹ کے داخلی دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا۔ اس کے
ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید رئیس واش روم میں ہو،
بھی اس نے میرے لیے بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا یعنی اسے لاک نہیں کیا تھا.....“ وہ سانس
رست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں بہ آہستگی دروازہ بند کر کے فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا لیکن اس وقت مجھے حیرت کا
شدید جھٹکا لگا جب رئیس مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ دونوں واش روم، کچن، بیڈ روم، ڈرائنگ روم
اور کامن روم اس کے وجود سے خالی تھے۔ مجھے وہاں بلا کر وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے پانچ
منٹ تک اس کا انتظار کیا پھر وہاں سے واپس آ گیا۔“

”آپ واپس آ گئے.....!“ میں نے تعجب خیز نظروں سے ملزم کو دیکھا۔ ”اور وہ

.....سر پرانز؟“

”جب رئیس مجھے فلیٹ پر نہیں ملا تو میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ یہی اس کا
سر پرانز ہے۔“ ملزم نے بڑی رसान سے بتایا۔ ”وہ ایک تجسس کے ساتھ مجھے اپنا نیا فلیٹ دکھانا
چاہتا تھا لہذا اس نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ میں گھوم پھر کر اس کا فلیٹ تو دیکھ ہی چکا تھا چنانچہ اس کے
فلیٹ سے نکل آیا پھر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا.....“ وہ رکا، اپنی متذبذب
آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر بے یقینی سے بولا۔

”یہ تو رات کو دس بجے مجھے معلوم ہوا کہ رئیس کو اس کے نئے فلیٹ میں قتل کر دیا گیا ہے۔ پولیس نے رئیس کے قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کر لیا تھا۔“

”اوہ.....!“ میں نے متاسفانہ انداز میں سانس خارج کی پھر کہا۔ ”مقتول کا یہ سر پرانز تو آپ کو بہت مہنگا پڑا.....!“

”جی ہاں!“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا مقتول پہلے بھی اس قسم کی احقانہ حرکتیں کرتا رہتا تھا؟“

”احقانہ تو نہیں کہہ سکتے۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”البتہ، اس کی اکثر حرکتوں اور فیصلوں کو عجیب و غریب کہا جاسکتا ہے۔ اسے نت نئے تجربات کا بہت شوق تھا.....!“

”مثلاً دوسری شادی کا تجربہ..... نجومی کی پیش گوئی پر ایمان لاتے ہوئے اپنا کاروبار پلیٹ دینے کا تجربہ..... کسی لکھت پڑھت کے بغیر ایک بھاری رقم آپ کے کاروبار میں لگانے کا تجربہ اور..... اپنے نئے فلیٹ پر سر پرانز کے بہانے بلا کر آپ کو قتل کے اس کیس میں پھنسانے کا تجربہ.....!“ میں نے قدرے مزاحیہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”ہیں نا.....؟“

”یہ سب تو اپنی جگہ درست ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”لیکن میں مقتول کو تصور دار نہیں کہوں گا۔ میرے تجربے کے مطابق مقتول دل کا بہت اچھا تھا۔ ہماری دوستی کافی پرانی تھی، کبھی ہمارے درمیان کسی بد مزگی نے جنم نہیں لیا۔ یہ پہلا موقع ہے اور..... مجھے یقین ہے، اس معاملے میں رئیس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ جس کسی بھی سفاک شخص نے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے وہی مجھے اس کیس میں پھنسانے کا بھی ذمے دار ہے۔ پتا نہیں، وہ بد بخت کون ہے.....؟“

”وہ بد بخت جو کوئی بھی ہے، زیادہ عرصے تک قانون کی نظر سے نہیں بچ سکے گا۔ اسے بہت جلد گرفت میں آنا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سنسنی خیز لہجے میں کہا پھر لازم سے پوچھا۔ ”خنک صاحب! مقتول کا اسٹائل جتنا بھی سادہ اور اعتماد سے لبریز کیوں نہ ہو مگر آپ تو پڑھے لکھے اور ماشاء اللہ! تجربہ کار بزنس مین ہیں۔ آپ نے مقتول سے چوتھائی کروڑ روپے لے کر اپنے کاروبار میں لگائے اور کوئی ایگریمنٹ وغیرہ تیار نہیں کرایا۔ یہی کوتاہی بلکہ کاروباری غفلت..... آج آپ کے خلاف جاری ہے۔“

”ڈاکومنٹس کی تیاری میں جو بھی تاخیر ہوئی اس کا سبب رئیس اور اس کی بے پروائی تھی۔“ طرزم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جب بھی اس سلسلے میں اس سے بات کی، اس نے کمال بے اعتنائی سے کہا..... یار خٹک! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہم کہیں بھاگے تھوڑی جا رہے ہیں۔ کاغذات بھی تیار ہو جائیں گے..... تمہیں اتنی فکر کیوں ہے۔ رقم تو میری لگی ہوئی ہے نا۔ جب مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے تو پھر تمہیں کیوں پریشانی ہے..... بس، اسی طرح یہ معاملہ آج سے کل اور کل سے پرسوں پر ہلتا رہا اور یہ دن آ گیا لیکن.....“ اس نے لمحاتی توقف کر کے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”پارٹنر شپ بزنس کے ڈاکومنٹس تیار نہ ہونے سے یہ کیس میرے خلاف کیسے جا رہا ہے..... یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی.....!“

”استغاثہ نے موقف اختیار کیا ہے کہ مقتول نے آپ کے کاروبار کو سنبھالا دینے کے لیے وہ رقم فراہم کی تھی۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”پھر جب آپ کا بزنس سنبھل گیا تو اس نے اپنی رقم کا تقاضا کرنا شروع کیا۔ آپ اسے بڑی خوبصورتی سے ٹالتے رہے پھر جب اس کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا تو آپ نے پچیس لاکھ کی رقم ہضم کرنے کے لیے مقتول کو ٹھکانے لگا دیا۔“

”یہ بالکل غلط ہے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”میں نے رئیس سے پچیس لاکھ کی رقم ادھار نہیں لی تھی جو کاروبار سنبھلتے ہی میں اسے واپس کر دیتا۔ وہ پچیس لاکھ روپے فراہم کر کے آئندہ تین سال کے لیے میرا بزنس پارٹنر بن گیا تھا اگرچہ اس کی حیثیت سلیپنگ پارٹنر کی تھی۔ ہمارے درمیان نفع و نقصان کے حوالے سے جو معاملات طے ہوئے تھے ان کے مطابق، ہر ماہ منافع کی ایک مخصوص رقم رئیس کو دیتا رہا ہوں۔ ایک سال سے اس کے دو، دو گھر ایسے ہی تو نہیں چل رہے اور..... اس نے بوہری بازار والا فلیٹ بھی کاغذ کے نقلی نوٹوں سے نہیں خریدا۔ ایک سال پہلے اس نے ہاتھ جھاڑ کر ساری جمع پونجی میرے حوالے کر دی تھی جو ایک امانت کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔ اگر میری نیت میں کوئی فتور ہوتا تو میں اس وقت معزز عدالت کے سامنے اس رقم کے امانت ہونے اور اپنے پاس محفوظ ہونے کا اقرار نہ کرتا اور جہاں تک لکھت پڑھت کا تعلق ہے نا.....!“

اچانک اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”میں مانتا ہوں کہ معاملہ چاہے بیس روپے کا ہو یا بیس کروڑ کا لیکن لین دین کرتے وقت لکھت پڑھت ضرور کر لینا چاہیے لیکن انسان کی زبان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہمارے پاس ایک زبان ہی تو ہوتی ہے جو ہم کسی کو دے سکتے ہیں۔ میرے اور رئیس کے درمیان یہ پارٹنرشپ بزنس اسی زبان پر چل رہا تھا اور اسی زبان سے میں معزز عدالت کے سامنے اس حقیقت کا اقرار کرتا ہوں کہ میرے مرحوم دوست رئیس نے میرے چلتے ہوئے کاروبار میں اپنے پچیس لاکھ روپے لگا رکھے تھے۔ وہ میرا سلپنگ پارٹنر تھا اور میں ہر ماہ اسے طے شدہ منافع دے رہا تھا۔ اس دوران میں رئیس نے ایک بار بھی مجھ سے رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔ وہ میرے ساتھ شراکت کر کے بہت خوش تھا۔ مجھے اس کی بے وقت موت کا انتہائی دکھ ہے۔ اگر اس کے ورثا مجھ سے طے شدہ منافع لیتے رہنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور اگر وہ لوگ متفقہ طور پر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ انہیں رقم واپس چاہیے تو ایک ماہ کی مہلت کے بعد میں مذکورہ رقم لوٹانے کو تیار ہوں۔ میں نے وہ پچیس لاکھ روپے رئیس سے لیے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں رقم اس کے ہاتھ پر رکھ کر اپنا فرض پورا کر لیتا۔ اب اس کے لواحقین میں دو بیویاں اور دو بچے ہیں۔ عدالت وراثت کی تقسیم کے سلسلے میں جو بھی فیصلہ کرے گی، مجھے منظور ہوگا..... میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں!“

”آپ نے یہ بھی بہت زیادہ کہہ دیا!“ میں نے اپنے موکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس، ایک آخری سوال..... یہ بتائیں کہ آپ کو اپنے کاروبار کو سنبھالا دینے کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی؟“

”میرے ایک قریبی دوست نے مجھ سے بیس لاکھ روپے کا فراڈ کر دیا تھا۔“ اجمل خٹک نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ ”اس صورت حال نے مجھے بری طرح پریشان کر دیا تھا اگر فوری طور پر مجھے بیس پچیس لاکھ نہیں ملتے تو میرا کاروبار اور ساکھ بری طرح متاثر ہو جاتی۔ رئیس اپنی رقم کسی چلتے ہوئے بزنس میں لگانے کا خواہش مند تھا اور مجھے رقم کی اشد ضرورت تھی لہذا وہ میرا سلپنگ پارٹنر بن گیا۔ بس، اتنی سی بات ہے.....“

”اگرچہ زیر سماعت کیس سے براہ راست اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”لیکن کیا آپ اپنے اس دوست کا نام بتانا پسند کریں گے جس نے آپ کے ساتھ بیس لاکھ کا فراڈ کیا تھا؟“

”اس مارِ آستین کا نام ہے ارشد وارثی!“

”کیا مقتول ارشد وارثی سے واقف تھا؟“

”بہت اچھی طرح.....“ ملزم نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔



آئندہ پیشی پر وکیل استغاثہ اپنے گواہوں کو پیش کرنے کے لیے پرتول ہی رہا تھا کہ میں نے جج سے درخواست کر دی۔

”جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں.....!“

کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر یا انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ جیسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے لہذا اس سے کسی وقت وکیل صفائی، وکیل استغاثہ یا جج کچھ بھی پوچھ سکتا ہے۔ میری فرمائش اور جج کے حکم پر آئی او جشید راؤ وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے کٹہرے کے قریب پہنچ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”راؤ صاحب! کیا میں آپ کو سب انکپٹر صاحب بھی کہہ سکتا ہوں؟“

یہ بظاہر ایک احقرانہ سا سوال تھا لیکن میں اپنے مخالفین پر ایسے ہی ہلکے پھلکے اور غیر متعلق انداز میں جرح کا آغاز کرتا ہوں۔ وہ بڑی فراخ دلی سے بولا۔

”میں عہدے کے اعتبار سے سب انکپٹر ہوں۔ اس کیس میں تفتیشی افسر کا کام کر رہا ہوں اور نام میرا جشید راؤ ہے۔ آپ مجھے راؤ، او، ایس آئی، جشید..... کچھ بھی کہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا!“

”تھینک یو راؤ صاحب!“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کو اس واقعے

کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ”پولیس روزنامے کے مطابق، قتل کی اس واردات کے بارے میں، دس اکتوبر کی شام سات بجے، برہان الدین نامی ایک شخص نے تھانے فون کر کے اطلاع دی تھی۔“

”کون برہان الدین؟“ میں نے پوچھا۔

”برہان الدین ایک عمر رسیدہ شخص ہے۔“ آئی او نے جواب دیا۔ ”یہ مقتول کی ساتھ والی بلڈنگ کا رہائشی ہے۔ اس کے فلیٹ کے کچن کی کھڑکی، مقتول کے فلیٹ کے کچن کے سامنے پڑتی ہے۔ دونوں بلڈنگز میں صرف ایک تنگ سی گلی کا فاصلہ ہے اور.....“

”برہان الدین نے فون پر کیا اطلاع دی تھی؟“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال کر دیا۔

”اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا تھا کہ برابر والی بلڈنگ میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے، آپ فوراً پہنچیں.....“ انکوآری آفیسر نے جواب دیا۔

”اور آپ فوراً وقوعہ پر پہنچ گئے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آئی او صاحب! آپ جائے واردات پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ساڑھے سات بجے!“ اس نے بتایا۔ ”برہان کی اطلاع بالکل درست تھی۔ مقتول اپنے ہی فلیٹ کے ایک بیڈروم میں مردہ پڑا تھا۔ اس کے سینے پر دو گولیاں فائر کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کا لباس خون آلود تھا۔ ایک نظر دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”مقتول کی لاش فلیٹ کے کس حصے میں پڑی تھی؟“

”بیڈروم میں.....!“ اس نے بتایا۔ ”بیڈ کے اوپر.....“

”آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ مقتول کو میرے موکل نے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟“

”گلی میں موجود ایک شخص نے ملزم کو مقتول کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔“ آئی

او نے بتایا۔ ”پھر یہ کہ مقتول کے فلیٹ میں جاہ جالزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ مقتول کی موت چھ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے اور اسی دوران میں ملزم کو مقتول کے

فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔“

”آپ نے ابھی جس شخص کا ذکر کیا ہے اس کا نام کیا ہے؟“

”کیا آپ اس شخص کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جس نے ملزم کو مقتول کے فلیٹ

میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟“ اس نے تصدیقی انداز میں کہا۔

”جی ہاں.....!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اس کا نام ہے..... الیاس!“، تفتیشی افسر نے بتایا۔ ”الیاس بھی اسی بلڈنگ میں رہتا

ہے جہاں قتل کی یہ واردات ہوئی ہے۔“

”کیا الیاس نامی یہ شخص ملزم کو ذاتی طور پر جانتا تھا؟“

”نہیں.....!“ آئی او نے نفی میں گردن ہلائی۔

”پھر آپ نے مقتول کے قتل کے سلسلے میں ملزم تک کس طرح رسائی حاصل کی؟“ میں

نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ ایک طویل داستان ہے۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”جس

بلڈنگ میں قتل کی یہ واردات ہوئی ہے وہاں نیچے گلی میں مختلف قسم کی دکانیں ہیں۔ بلڈنگ کے عین

نیچے ایک ہیئر ڈریسر کی دکان اور ایک چائے کا ہوٹل بھی ہے۔ ہیئر ڈریسر کا نام بشارت ہے۔

بشارت، مقتول سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اپنی شادی کی ساری جیولری مقتول ہی کی دکان

سے خریدی تھی۔ جب بشارت سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے مقتول کے سولجر بازار والے فلیٹ کے

بارے میں بتایا۔ ہم وہاں پہنچے تو مقتول کی بیوی شہلا سے ملاقات ہوئی۔ جب شہلا کو بتایا گیا کہ اس

قد کا ٹھہ اور وضع قطع کا آدمی مقتول کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا تو اس نے فوراً ملزم کا نام لے دیا اور یہ

بھی بتایا کہ ملزم، مقتول کے پچیس لاکھ روپے دبائے بیٹھا ہے۔ ہم الیکٹرونکس مارکیٹ پہنچے۔ ملزم کا

آفس تو بند ہو چکا تھا لیکن آس پڑوس سے اس کے گھر کا ایڈریس مل گیا۔ اس طرح ہم رات دس

بجے ملزم کو اس کے گھر واقع ڈیفنس فیزٹو سے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

”ویل ڈن!“ آئی او کے خاموش ہونے پر میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر

پوچھا۔ ”کیا مقتول کی بیوی شہلا نے واقعی یہ کہا تھا کہ ملزم ان کے پچیس لاکھ روپے دبائے بیٹھا

ہے؟“

”ہاں ہاں، بالکل.....!“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”وہ اس سلسلے میں خاصی برہم تھی جیسی تو ہمیں زیادہ شک ہوا پھر جب مقتول کے فلیٹ میں کئی مقامات پر ملزم کے فنگر پرنٹس بھی مل گئے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ مقتول کی موت کا ذمہ دار صرف اور صرف ملزم ہی ہے.....!“

”آپ نے مقتول کے فلیٹ کی تلاشی کے دوران میں آلہ قتل بھی برآمد کر لیا تھا۔“ میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ”اعشاریہ تین دو کیلی برکانہ مذکورہ ریوالور آپ کو کہاں سے ملا تھا؟“

”بیڈ روم میں..... اسی بیڈ کے نیچے سے جہاں مقتول کی لاش پڑی ہوئی تھی۔“ آئی او نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”یقیناً آپ نے آلہ قتل پر بھی ملزم کے فنگر پرنٹس ڈھونڈ نکالے ہوں گے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

”نہیں جناب.....!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آلہ قتل پر تو ملزم کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے تھے۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا.....؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”مطلب.....“ وہ گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”ظاہر ہے، ملزم نے ریوالور کو بیڈ کے نیچے پھینکنے سے پہلے اچھی طرح صاف کر دیا ہوگا.....“

”اور اس کا ایک مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ میری موکل کا اس ریوالور یا اس واردات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔“ میں نے تفتیشی افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے..... ہیں نا؟“

”اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی.....“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میرا کام حقائق کو سامنے لانا ہے اور عدالت میں پیش کر کے انصاف کے تقاضے پورے کرنا ہے.....“

”اوکے.....!“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

”جناب عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“

اس کے بعد مقتول کی دوسری بیوی بلکہ بیوہ شہلا کو گواہی کے لیے کٹہرے میں لایا گیا۔ جب شہلا کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ وہ مختلف سوالات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ ملزم ایک چال باز اور بدنیت شخص ہے۔ اس نے ٹھگی لگا کر مقتول

سے پچیس لاکھ روپے ہتھیا لیے تھے اور اب رقم واپس کرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ حتیٰ کہ وکیل استغاثہ نے یہاں تک بھی کہا کہ اب جو ملزم قاتل کی حیثیت سے سامنے آ چکا ہے تو وہ اپنی گردن بچانے کے لیے بڑی شرافت سے رقم واپس کرنے کی بات کر رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ.....!“

وکیل استغاثہ نے گواہ کی جان چھوڑی تو میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے بڑے مختلف انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے گواہ سے کہا۔

”شہلا صاحبہ! میں بہت کنفیوژ ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ آپ کے ساتھ اظہار تعزیت بھی کرنا ہے اور آپ کو ایک مبارک باد بھی دینا ہے.....!“

”مبارک باد.....!“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”کس چیز کی مبارکباد؟“

”آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ اظہار تعزیت کس سلسلے میں؟“ میں نے شامی لہجے میں کہا۔

”وہ تو انڈرسٹوڈ ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ رئیس کی ناگہانی موت پر دکھ کر اظہار کرنا چاہتے ہیں لیکن مبارک باد والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....؟“

شہلا کے انداز و اطوار سے ذرا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ نئی نئی بیوہ ہوئی ہے، زرق برق لباس کے علاوہ اس نے اچھا خاصا بناؤ سنگار بھی کر رکھا تھا۔ رئیس کی موت کا کوئی خاص اثر اس کی شخصیت پر نظر نہیں آتا تھا۔ جبکہ اس کیس کے دوران میں مقتول کی پہلی بیوی سے بھی میری ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اس کو دیکھ کر یقین آ جاتا تھا کہ ان لوگوں کا سب کچھ چھن گیا ہے۔ شہلا کا معاملہ بڑا مختلف اور غیر فطری سا نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پچیس کے اریب قریب تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور طرح دار عورت تھی۔ اس کے نقوش اور نسوانی خطوط میں بڑی کشش پائی جاتی تھی۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شہلا صاحبہ! آپ وکیل صفائی کی حیثیت سے میرے بارے میں چاہے کچھ بھی رائے رکھتی ہوں اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کے شوہر کی موت کا بہت افسوس ہے اور جہاں تک مبارکباد کا تعلق ہے.....“ میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ ملزم نے معزز عدالت کے سامنے آپ لوگوں کے پچیس لاکھ روپے واپس کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ اس کیس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد،

ایک آدھ ماہ میں ضروری قانونی کارروائی کے بعد یہ رقم آپ کے حوالے کر دی جائے گی.....“

”پہلی بات تو یہ کہ.....“ اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”ان پچیس لاکھ میں کوئی اکیلی وارث نہیں ہوں۔ اس رقم میں رئیس کی پہلی بیوی اور بچوں کا بھی حصہ ہے۔“ یہ بات اس نے ایسے انداز میں کہی تھی کہ جیسے اگر وہ اکیلی وارث ہوتی تو زیادہ خوشی کی بات تھی۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”یہ رقم تو ملزم نے واپس کرنا ہی تھی۔ اگر وہ رئیس کی زندگی میں ہماری رقم لوٹا دیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس بدنیت شخص نے پچیس لاکھ ہڑپ کرنے کے لیے میرے شوہر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا اور اب جبکہ اسے پھانسی کا پھندا نظر آ رہا ہے تو رقم واپس کر کے جان چھڑانے کے چکر میں ہے.....!“

شہلا کے لب و لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے موکل کو اپنے شوہر کا قاتل سمجھتی ہے۔ میں نے اس کی نیت کا احوال جاننے کے لیے ذرا مختلف انداز میں جرح شروع کی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”شہلا صاحبہ! کیا یہ سچ ہے کہ آپ سے شادی کے بعد مقتول کے کاروباری معاملات بڑی تیزی سے زوال پذیر ہونے لگے تھے؟“

”ہاں، یہ بات کسی حد تک درست ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”وہ دھندے کی خرابی کا اکثر و نارتار ہوتا تھا۔“

”ایک نجومی نے مقتول کو بتایا تھا کہ دوسری شادی صحیح وقت پر نہیں ہوئی اور اس کے مالی حالات کی خرابی کا سبب آپ ہیں؟“

”کسی استاد فدا نامی نجومی نے ایسی پیش گوئی کی تو تھی لیکن میں ان فضولیات پر یقین نہیں رکھتی۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔

”استاد فدا نے مقتول کو مشورہ دیا تھا کہ وہ دکان یا دوسری بیوی میں سے کسی ایک کو چھوڑ دے تو اس کے مالی حالات اچھے ہو جائیں گے۔“ میں نے ایک مخصوص انداز میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مقتول نے آپ کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے دکان اور کاروبار کو فروخت کر کے اس سے حاصل ہونے والے پچیس لاکھ روپے کو ملزم کے چلتے ہوئے کاروبار میں لگا

دیئے تھے۔ نجوی نے کہا تھا کہ اگر وہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے شخص کے کاروبار میں لگائے گا تو نقصان کا اندیشہ ٹل جائے گا؟“

”میں نے کہا ہے نا، میں اس نوعیت کی گمراہ کن باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”یہ نجوی لوگ تو پتا نہیں کہاں کہاں کی اڑا کر لوگوں کو دواہموں میں ڈالتے رہتے ہیں۔ رئیس جیسے سیدھے سادے اور قدرے بے وقوف لوگ بڑی آسانی سے شاطر و کاریاں نجومیوں اور بزنس مینوں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ناپسندیدہ نظر سے اجمل خٹک کی طرف دیکھا پھر کسی مفتی کے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”میری نظر میں رئیس کے کاروبار کی تباہی کا سب سے بڑا سبب وہ خود تھا!“

”وہ کس طرح؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”مجھ سے شادی کے بعد وہ خاصا کاہل الوجود ہو گیا تھا۔“ وہ بڑی جرات مندی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”ہماری شادی کو چھ ماہ ہو گئے تھے لیکن وہ سارا سارا دن میرے پہلو سے لگا بیٹھا رہتا تھا۔ دکان کی طرف سے اس کا دھیان بالکل ہٹ گیا تھا۔ دکانداری توجہ اور قربانی مانگتی ہے۔ رئیس نے کاروبار کے تقاضوں کو نظر انداز کیا اور دھندلاتا ہونے لگا۔ اس پر استاد خدا کی فضول پیش گوئی کو اس نے ذہن میں نقش کر لیا۔ نتیجہ وہی برآمد ہوا جو اس طرح کے معاملات میں نکلا کرتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اپنے بزنس پر توجہ دینے کے بجائے رئیس نے سازی جمع پونجی کسی اور کے کاروبار میں لگا دی۔ یہ اقدام رئیس کی سنگین ترین غلطی تھی۔“

”کیا مقتول نے اس سلسلے میں آپ سے مشورہ نہیں کیا تھا؟“

”اگر مجھ سے مشورہ کیا ہوتا تو میں اسے ہرگز ایسا نہ کرنے دیتی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”پچیس لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ پیسا، پیسے کو کھینچتا ہے وکیل صاحب! ایک لاکھ جمع کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جب پہلا لاکھ انسان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو پھر اس سے دوسرے لاکھ کا نامنا مشکل نہیں رہتا۔ مجھے تو رئیس کی موت سے چند ماہ پہلے پتہ چلا تھا کہ اس نے اپنا سب کچھ بیچ باج کر اپنے کسی دوست اجمل خٹک کے کاروبار میں لگا دیا ہے۔ ملزم سے بھی میری جان پہچان اس کے بعد ہی ہوئی تھی۔ میں نے اس معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہی رئیس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ ملزم سے اپنی رقم واپس لے لے۔ بڑی مشکل سے میری بات رئیس کی

سمجھ میں آئی اور اس نے ملزم سے رقم کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ پہلے تو ملزم مختلف حیلوں بہانوں سے رئیس کو ٹالتا رہا پھر.....؟“ وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔

شہلا کے ادھورے جملے کا مطلب مجھ سمیت عدالت میں موجود ہر شخص بخوبی جانتا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو بڑی چابک دستی سے سمیٹتے ہوئے کہا۔

”شہلا صاحبہ! آپ کا شوہر اب اس دنیا میں موجود نہیں جو اسے کسی تصدیق یا تردید کے لیے عدالت تک لانا کی زحمت دی جائے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مقتول نے ایک بار بھی ملزم سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس پارٹنر شپ بزنس سے بہت خوش اور مطمئن تھا کیونکہ اسے ہر ماہ بڑا معقول منافع حاصل ہو رہا تھا۔“

”معتول منافع..... اونہہ!“ وہ حقارت بھرے انداز میں گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں وکیل صاحب..... ہم نے تو کوئی منافع شفاف گھر میں آتے نہیں دیکھا۔ میں تو سمجھتی ہوں، ملزم چکنی چڑی باتوں سے رئیس کو ایسے ہی ٹر خا رہا تھا یا ہو سکتا ہے، پاکٹ منی کے طور پر اس کی مٹھی میں کچھ رکھ دیتا ہو.....!“

”شہلا صاحبہ! لگ بھگ ایک سال پہلے مقتول نے اپنی دکان اور دیگر جمع پونجی سمیٹ کر مبلغ پچیس لاکھ روپے ملزم کے بزنس میں لگا دیے تھے۔“ میں نے بڑے سادہ انداز میں استفسار کیا۔ ”کیا جیولری کی اس دکان کے علاوہ بھی مقتول کا کوئی کاروبار تھا؟“

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر جواب دیا۔ ”اگر کوئی تھا..... تو میرے علم میں نہیں ہے!“

”یہ حیرت کی بات نہیں کہ ملزم ایک سال سے مقتول کو سوکھا ٹر خا رہا تھا اور اس دوران میں مقتول بڑی خوش اسلوبی سے دو، دو گھر بھی چلا رہا تھا.....“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”نہ صرف دو، دو گھر چلا رہا تھا بلکہ بوہری بازار میں گہڑی کا ایک فلیٹ بھی خرید لیا تھا۔ جس شخص کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو، وہ یہ سب کچھ کیونکر کر سکتا ہے..... اس سوال کا جواب ہے آپ کے پاس؟“

”میں اس دوران میں اپنا گھر جس طرح چلاتی رہی ہوں، وہ میں ہی جانتی ہوں۔“ وہ غفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ”ایک ایک کر کے میرا زیور بک گیا ہے۔ رئیس کی پہلی بیوی کا گزارہ کیسے چلتا تھا، یہ آپ اسی سے پوچھیں.....؟“

”میں نے اس سے پوچھا ہے جی تو آپ سے تصدیق کر رہا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”فریدہ نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ مقتول ہر ماہ گھر کے خرچے کی مدد میں اسے ایک معقول رقم دیتا رہا ہے۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ مقتول نے ملزم کے کاروبار میں ایک بھاری رقم لگا رکھی تھی۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں فریدہ کو گواہی کے لیے عدالت میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔“

”آپ اپنا یہ شوق ضرور پورا کیجیے گا۔“ وہ رکھاڑی سے بولی۔ ”مجھے فریدہ کی گواہی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو حقیقت تھی، وہ میں نے بیان کر دی ہے۔“

شہلا نے اپنے حلفیہ بیان میں اور بعد ازاں میری جرح کے جواب میں جو بھی تفصیل سنائی تھی وہ حقیقت سے کافی دور تھی۔ وہ مقتول سے خفا، ملزم سے نالاں اور مقتول کی پہلی بیوی بچوں سے بے حد بیزار نظر آتی تھی۔ اس کے اس رویے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ وہ پچیس لاکھ روپے کی خاندانی تقسیم پر خوش نہیں تھی۔ فریدہ اور اس کے بچوں کی شہلا کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اس خطرناک رقم پر صرف اور صرف اپنا حق سمجھتی تھی۔ ممکن ہے، اس نے مقتول کو اپنی رقم ملزم کے کاروبار میں سے نکالنے کے لیے کہا ہو اور اس نے بیوی کی بات پر کان نہ دھرے ہوں لہذا وہ مقتول کے ساتھ ساتھ ملزم کے بھی خلاف ہو گئی ہو۔ ایسا عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر بیوی شوہر سے کوئی شے مانگے اور شوہر اسے نہ دے بلکہ وہی چیز کسی اور کو دے دے تو بیوی کو اس ”اور“ سے نفرت اور عداوت ہی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شوہر کا بھی رد عمل ہوتا ہے اگر بیوی ایسی حرکت کرے تو..... شہلا کی ذہنیت متنی نوعیت کی تھی۔ وہ ملزم کی طرف سے اچھی خاصی بھری بیٹھی تھی اور اب جو اسے اس کے خلاف بولنے کا موقع ملا تو وہ جی بھر کر زہر اگل رہی تھی۔ وہ ملزم کی اس قدر دشمن ہو گئی تھی کہ وہ اسے اپنے شوہر کا قاتل نظر آنے لگا تھا۔

”آپ کی بیان کردہ حقیقت کو میں نے پوری توجہ سے سنا ہے شہلا صاحبہ!“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ وقوعہ کی سہ پہر مقتول نے ملزم کو کون سا سر پرانز دینے کے لیے اپنے فلیٹ پر بلایا تھا؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ بیزاری سے بولی۔

”مقتول نے سر پرانز کے حوالے سے آپ سے کوئی بات نہیں کی تھی؟“

”ہرگز نہیں.....!“ اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ تو مجھے ملزم کے ذہن کی اختراع لگتی ہے..... مقتول کے فلیٹ تک پہنچنے کا خوب صورت بہانہ.....!“

میں نے مزید ایک دو سوالات کے بعد جرح موقوف کر دی۔



آئندہ پیشی پر اس عمر رسیدہ شخص کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا جس نے تھانے فون کر کے اس خونی واقعے کی اطلاع دی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، استغاثہ کے اس گواہ کا نام برہان الدین تھا۔ برہان کی عمر ستر سے متجاوز تھی اور وہ سانس کے عارضے یعنی دمہ کا مریض تھا۔

وکیل استغاثہ نے گھما پھرا کر اس سے آٹھ دس سوالات کیے اور جلدی فارغ کر دیا۔ اس کے بعد میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ مجھے گواہ کی حالت اور صحت پر واقعات ترس آ رہا تھا تاہم اپنے پیشے کا تقاضا نبھانا بھی ضروری تھا چنانچہ میں نے نہایت ہی نرم اور شائستہ انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔

”برہان صاحب! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کو اس عمر میں، عدالتی بکھیروں سے نمٹنے کے لیے زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔ میں آپ سے مجبوراً چند سوالات کروں گا۔ آپ کو.....“

”آپ زیادہ پریشان نہ ہوں وکیل صاحب!“ وہ جھرجھرتائی ہوئی آواز میں مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ آپ پوچھیں، جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں.....“

میں نے پوچھا۔ ”قبلہ! آپ نے تھانے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے بتایا تھا کہ برابر کی بلڈنگ میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے..... فوراً پہنچیں!“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کیا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ برابر کی بلڈنگ میں قتل ہو گیا ہے.....؟“

”پہلی بات تو یہ کہ.....“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ ”میں نے تھانے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ میرے ساتھ والی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں کوئی سنگین واردات ہو گئی ہے اور یہ اطلاع

میں نے اس بنیاد پر دی تھی کہ پہلے میں نے مذکورہ فلیٹ میں دو فائروں کی آواز سنی، اس کے بعد کسی انسان کے چیخنے کی آواز ابھری۔ یہ دونوں آوازیں ایسی مربوط اور دہشت ناک تھیں کہ میں ہل کر رہ گیا تھا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی آیا کہ مجھے پولیس کو اطلاع کرنا چاہیے، سو میں نے تھانے فون کر دیا.....“

وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما۔ دو چار گہری سانسیں لے کر اپنے تنفس کو درست کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”قتل کی واردات والے الفاظ پولیس نے اپنی طرف سے شامل کیے ہیں۔ وہاں چونکہ واقعی ایک انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا، شاید اس لیے بھی ”قتل“ کا لفظ میری اطلاع کے ساتھ تھی کر دیا گیا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، پولیس والے اس قسم کی حرکتیں اکثر کرتے رہتے ہیں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں انگواڑی آفسر کی جانب دیکھا پھر دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”حضرت! اپنے ذہن پر زور دے کر اچھی طرح سوچیں اور مجھے بتائیں کہ آپ نے فائر کی آواز پہلے ہی یا چیخنے کی آواز.....؟“

”م..... میرا خیال ہے.....“ وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”فائر کی آواز پہلے آئی تھی..... نہیں، چیخنے کی آواز پہلے..... شاید یہ دونوں آوازیں ایک ساتھ ہی ابھری تھیں..... میں نے اتنی باریک بینی سے سننے کی کوشش نہیں کی تھی..... فائرنگ کی خوفناک آواز نے مجھے بے پناہ خوف زدہ کر دیا تھا.....“

”اب آپ کو ذرا بھی خوف زدہ یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیونکہ وہ ہولناک منظر بہت پیچھے رہ گیا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ آپ نے دونوں آوازیں بہ یک وقت سنی ہوں گی۔“

”اچھا.....!“ اس نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ بات آپ اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہیں؟“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کی روشنی میں۔“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اس رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت فوراً ہی واقع ہو گئی تھی۔ ویسے بھی جب کسی کے دل یا

دماغ میں گولی دھنستی ہے تو اس شخص کو چیخنے چلانے کا موقع نہیں ملتا۔ مقتول نے قاتل کے ہاتھ میں ریوالتور دیکھ کر ایک آدھ چیخ ماری ہوگی اور اگلے ہی لمحے اس کا کام تمام ہو گیا ہوگا۔“

”آپ کی بات میرے دل کو لگ رہی ہے وکیل صاحب.....!“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ چیخ اور فائرنگ کی آواز ایک ساتھ ہی میری سماعت تک پہنچی تھیں۔ میں ہی بوکھلا گیا تھا شاید.....!“

”اب آپ کو بوکھلانے یا جھنجھلانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ میں نے بڑے ادب سے کہا۔ ”آپ اطمینان کے ساتھ اپنے گھر جائیں۔ آئندہ آپ کو عدالت میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پتا نہیں، آپ کو اس قسم کی زحمت کیوں دی گئی ہے.....!“

جرح کے اختتام پر برہان الدین تشکر آ میز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ مخالف پارٹی کا گواہ تھا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کے دوران میں مختلف زاویوں سے اسے میرے موکل کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنے رویے اور حسن اخلاق سے استغاثہ کے گواہ کو اپنا ہم نوا بنایا تھا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ برہان الدین کو بلا وجہ عدالت میں کھینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کی گواہی کسی بھی حوالے سے استغاثہ کے لیے سودمند ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔

برہان الدین کے بعد الیاس نامی شخص کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا۔ الیاس وہی شخص تھا جس نے وقوعہ کے روز ملزم کو مقتول کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ یہ گواہ استغاثہ کے لیے جتنا اہم تھا اس سے کہیں زیادہ اہم میرے لیے تھا۔ الیاس نامی اس شخص کی عمر تیس کے قریب ہوگی۔ وہ سائٹ ایریا کی کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔

وکیل استغاثہ نے جرح مکمل کرنے کے بعد گواہ کو فارغ کیا تو جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں ڈنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے گواہ کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

”الیاس صاحب! آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟“

”میں سائٹ ایریا کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔“ اس نے تحمل سے جواب دیا۔

”کس فیکٹری میں؟“

اس نے جواب میں ایک ٹیکسٹائل فیکٹری کا نام بتا دیا۔

”کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے ملزم کو مقتول کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی ہاں.....“ اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”اس وقت تم خود کہاں تھے؟“

”میں نیچے چائے کے ہوٹل پر بیٹھا ہوا تھا۔“

”یعنی جو ہوٹل گلی میں ہیئر ڈریسر کے برابر میں واقع ہے؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ”مقتول کا فلیٹ بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر واقع ہے نا؟“

”جی ہاں.....“

”کمال ہے.....“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم نے گلی میں واقع چائے کے

ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ملزم کو مقتول کے فلیٹ میں داخل ہوتے کیسے دیکھ لیا؟“

”میں نے ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے نہیں دیکھا تھا!“

”پھر؟“

”جب ملزم اس بلڈنگ میں داخل ہوا تو میں اس کے پیچھے گیا تھا۔“ گواہ وضاحت

کرتے ہوئے بولا۔ ”جب یہ مقتول کے گھر میں داخل ہو گیا تو میں اوپر کی طرف چلا گیا تھا۔“

”تم خود بھی تو اس بلڈنگ میں رہتے ہو نا؟“ میں نے استفسار کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”جی ہاں..... میں بلڈنگ کے تھرڈ فلور پر رہتا

ہوں۔“

”ہوں.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ”تم نے ملزم کو بلڈنگ

میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کے تعاقب میں چل پڑے۔ کیا یہ بھی تمہاری کسی ڈیوٹی کا حصہ ہے؟“

”ایسا بھی سمجھ لیں جناب!“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

”بات میرے سمجھنے کی نہیں ہے الیاس صاحب اور نہ ہی اس سے مسئلہ حل ہوگا۔“ میں

نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جو حقیقت ہے، وہ بیان کریں۔ کیا آپ فیکٹری کی نوکری سے تھکتے نہیں

ہیں جو ایک ڈیوٹی محلے میں بھی سنبھال رکھی ہے.....؟“

”یہ ڈیوٹی تو ہماری بلڈنگ میں رہنے والے ہر شخص نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔“ وہ

نخریہ لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”دراصل..... آج کل یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں

کہا۔

”میں کچھ نہیں سمجھا.....؟“ میں نے متذبذب نظر سے اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے، پچھلے ایک ماہ میں ہماری گلی میں چار ڈکیتیاں ہو چکی ہیں۔“ اس

نے ٹھکراؤ آمیز لہجے میں بتایا۔ ”جن میں سے ایک ہماری بلڈنگ میں، لہذا ہر نئے اور مشکوک بندے پر

نظر رکھنا پڑتی ہے.....“

”نئے اور مشکوک بندے پر.....“ میں نے اسی کے الفاظ دہرائے اور کہا۔ ”کیا تمہاری

نظر میں ملزم مشکوک بندہ دکھائی دیتا ہے.....؟“

”میں نے اس کا تعاقب نیا بندہ جانتے ہوئے کیا تھا۔“ استغاثہ کے گواہ الیاس نے

پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”اوردیکھ لیں..... یہ کیسا مشکوک ثابت ہوا ہے۔ اس پر قتل کا مقدمہ چل

رہا ہے.....“

”ہاں بھئی..... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن

ہلائی۔ ”میرے موکل پر قتل کا مقدمہ تو چل رہا ہے لیکن اس بے چارے نے قتل کیا نہیں.....“

”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ ملزم نے مقتول رئیس کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا؟“

اس نے زیادہ اسماٹ بننے کی کوشش کی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہے جس کی بنا پر کہا جائے کہ

مقتول کو میرے موکل ہی نے قتل کیا ہے؟“

”یہ ثابت کرنا میرا کام نہیں ہے جناب!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں تو یہاں صرف

گواہی دینے آیا ہوں۔ ملزم کا جرم ثابت کر کے اسے عدالت سے سزا دلوانا پولیس اور استغاثہ کی

ذمہ داری ہے۔ آپ نے جو کچھ مجھ سے پوچھا ہے یہی سوال آپ ان لوگوں سے کریں۔“

”ٹھیک ہے، اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں ان سے ضرور یہ سوال کروں گا۔“ میں نے

معتدل لہجے میں کہا۔ ”آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں نا، عدالت میں آپ ایک سچی اور کھری گواہی دینے آئے ہیں؟“

”بالکل..... اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں نے کسی بھی مرحلے پر غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔“

”خدا کو حاضر ناظر جان کر میرے ایک سوال کا جواب دیں.....!“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”جناب وکیل صاحب!“ وہ قدرے خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے عدالت میں اپنا بیان رکارڈ کرانے سے پہلے سچ بولنے کا حلف اٹھایا تھا اور الحمد للہ! میں اس حلف پر قائم ہوں۔ میں یہاں کٹہرے میں کھڑا ہو کر خدا کو حاضر ناظر ہی جان رہا ہوں۔ آپ بے دھڑک مجھ سے کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ میں اس کا بالکل درست جواب دوں گا۔“

الیاس کے اعتماد نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ اتنا مضبوط لہجہ یا تو کسی مجھے ہوئے اداکار کا ہو سکتا تھا اور یا پھر کسی سچے انسان کا۔ اس کے انداز میں کھرے پن کی مخصوص کھنک تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے ہوئے سوال کیا۔

”الیاس صاحب! کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے میرے موکل کو یہ قتل کرتے دیکھا

تھا؟“

”نہیں!“ اس نے دو ٹوک اور چٹانی لہجے میں جواب دیا۔

”آپ نے فائرنگ کی آواز تو سنی ہوگی؟“

”جی ہاں سنی تھی.....“

”کتنی گولیاں فائر ہوئی تھیں؟“

”دو.....!“

”دونوں فائرز کا درمیانی وقفہ کتنا تھا؟“

”اس وقفے کو ناپنا اگر نہایت ضروری ہو تو آپ ایک سیکنڈ کہہ سکتے ہیں۔“ وہ کندھے

اچکاتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال میں دونوں فائر یکے بعد دیگرے ہوئے تھے۔“

”استغاثہ کے ایک بزرگ گواہ جناب برہان الدین صاحب نے ان فائرز کے ساتھ ہی

انسانی چیخ بھی سنی تھی۔“ میں نے الیاس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسی کوئی آواز آپ کی سماعت تک بھی پہنچی تھی؟“

”جی نہیں..... بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔

”شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ کی رہائش تھرڈ فلور پر ہے اور قتل کی یہ واردات فرسٹ فلور کے ایک فلیٹ میں پیش آئی تھی۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”برہان الدین اگرچہ برابر والی بلڈنگ میں رہتے ہیں لیکن ان کے بچن کی کھڑکی، مقول کے بچن کی کھڑکی کے عین سامنے پڑتی ہے۔ جی انہوں نے چیخ کی آواز بہ آسانی سن لی تھی۔“

”یہ تو آپ نے بالکل درست فرمایا کہ برہان صاحب نے کن وجوہ کی بنا پر مقتول کے چیخنے کی آواز سن لی تھی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن میرے بارے میں آپ کا اندازہ غلط ہے.....“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے الجھن آمیز حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ جب رئیس کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، میں اپنے گھر میں موجود نہیں

تھا!“

”گھر میں نہیں تھے تو پھر کہاں تھے؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”نفقہ فلور پر!“ اس نے جواب دیا۔

”نفقہ فلور!“ میں نے بے یقینی سے دہرایا۔ ”لیکن مذکورہ بلڈنگ تو صرف فورٹھ فلور تک

ہے.....؟“

”بلڈنگ کی چھت پر!“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”پانی والی بالائی ٹینکی کے

قریب..... فورٹھ فلور کے اوپر تو نفقہ فلور ہی ہوتا ہے نا.....؟“

”بلڈنگ کی چھت پر تم اس وقت کیا کر رہے تھے؟“ میں پوچھتے بناندرہ سکا۔

”مشکوٰۃ آدمی کو تلاش کر رہا تھا.....“ وہ قطعی لہجے میں بولا۔

وہ انکشاف در انکشاف کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں

پوچھا۔ ”تم کس مشکوک بندے کو ڈھونڈنے چھت پر گئے تھے۔ ملزم کو تو تم نے اپنی آنکھوں سے

مقتول کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا؟“

”اس وقت مجھے ملزم کی نہیں بلکہ اس مشکوک آدمی کی تلاش تھی جو ملزم سے پہلے اور مقتول کے فوراً بعد ہماری بلڈنگ میں داخل ہوا تھا۔“ گواہ نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

”کون تھا وہ.....؟“ میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ ”اس کا نام کیا تھا..... کیا تم اس شخص کو جانتے ہو.....؟“

میرے پے در پے سوالات نے حاضرین عدالت میں تجسس اور سنسنی کی ایک لہری دوڑا دی تھی۔ جج سمیت وہاں موجود ہر شخص کی نظر ہی پر لگی ہوئی تھی، یعنی مجھ پر اور الیاس پر۔ وہ میرے سوالات کے جواب میں بتانے لگا۔

”وکیل صاحب! اگر وہ شخص میرا شناسا ہوتا تو میں آپ کو ضرور اس کا نام بتا دیتا اور اس صورت میں مجھے اس کا پیچھا کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔“

”مقتول رئیس کے قتل میں اس بے نام اور نامعلوم بندے کا ہاتھ ہو سکتا ہے!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”الیاس صاحب! آپ مجھے اس مشکوک شخص کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟“

”تفصیل کوئی لمبی چوڑی نہیں ہے جناب۔“ گواہ نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔

”جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، ڈکیٹی کی وارداتوں کے بعد ہم سب چوکنار اور ہوشیار ہو گئے تھے۔ جب مقتول بلڈنگ میں داخل ہوا تو میں چائے کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں چونکہ مقتول کے بارے میں جانتا تھا، وہ اب ہماری بلڈنگ کا رہائشی ہے اس لیے میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن اس کے پیچھے پیچھے تھوڑا فاصلہ رکھ کر وہ مشکوک بندہ بھی بلڈنگ کے زینے کی طرف بڑھ گیا تھا لہذا میں فوراً حرکت میں آ گیا لیکن جب تک میں ہوٹل سے نکل کر بلڈنگ کے اندر پہنچتا، مذکورہ بندہ غائب ہو چکا تھا۔ میں زینے پھلانگتے ہوئے آخری فلور تک گیا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں واپس ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا.....“

”کیا اس وقت آپ نے چھت پر جا کر نہیں دیکھا تھا؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”نہیں!“ الیاس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”اسی لیے جب تھوڑی دیر کے بعد ملزم بلڈنگ میں داخل ہوا تو میں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگ گیا تھا پھر جب یہ مقتول کے فلیٹ میں

داخل ہو گیا تو میں چھت کی طرف نکل گیا تاکہ دیکھ سکوں کہ وہ مشکوک بندہ کہیں چھت پر تو چھپا نہیں بیٹھا.....!“

”کیا ملزم کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ تم اس کے تعاقب میں ہو؟“

”بالکل نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ میں ملزم کے پاس سے گزر کر ایک فلور اوپر چلا گیا تھا اور وہاں ایک آڑ میں چھپ کر اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس نے ایک دوسرے مقتول کے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجائی، شاید مقتول نے اسے اندر بلا لیا تھا۔ جب یہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تو اس کے بعد ہی میں نے چھت کا رخ کیا تھا۔ اس لمحے مجھے ملزم کی خطرناکی کا اندازہ نہیں تھا.....!“

”بری بات الیاس صاحب!“ میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ”کسی کو خواہ مخواہ خطرناک قرار نہیں دیا کرتے۔ آپ ملزم کو فی الحال بھول جائیں۔ آپ پہلی فرصت میں معزز عدالت کو اس مشکوک شخص کے قہ کاٹھ، وضع قطع اور حلیے وغیرہ کے بارے میں بتائیں جس کی تلاش میں آپ بلڈنگ کے ففٹھ فلور..... یعنی چھت پر چلے گئے تھے.....؟“

استغاثہ کے گواہ الیاس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”قد چھفٹ سے نکلتا ہوا، دبلا پتلا جسم لیکن ڈھانچا خوب پھیلا ہوا۔ کندھے اٹھے ہوئے، موٹے ہونٹ، گھنی ہڈی، مارکہ مونچھیں، سر پر بالوں کے نام پر ایک جھالری باقی، بھوئیں موٹی اور تپتی ہوئی، چہرے پر کٹ کا دائمی نشان اور.....“

”اور بائیں پاؤں میں لنگ.....!“ ملزم نے سرسراتے ہوئے لہجے میں گواہ کی بات کو مکمل کر دیا۔ ”چال میں بڑی واضح لنگز اہٹ..... ہے نا؟“

”لیکن آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی؟“ گواہ نے حیران ہو کر میرے موکل سے پوچھا۔

”کیا آپ اس مشکوک بندے کو جانتے ہو.....؟“

”جی..... جی، سو فیصد.....“ وہ اپنی گردن کو تائیدی انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔

”اگر وہ لنگز اکر چل رہا تھا تو..... تو پھر..... وہ وہی ہے..... شاید رئیس مجھے اسی مردود کے حوالے سے کوئی سرپرانزدینا چاہتا تھا.....“

”آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں خٹک صاحب.....!“ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
 ”کھل کر بتائیں، کون مردود.....؟“
 ”ارشاد وارثی.....!“ اجمل خٹک نے زہریلے انداز میں کہا۔



اس انکشاف کے بعد کہ اس کیس کے ملزم اجمل خٹک کے ساتھ ایک سال پہلے بیس لاکھ روپے کا فراڈ کرنے والا شخص ارشد وارثی، مقتول کے آس پاس دیکھا گیا ہے، اس کیس کا پانا ہی پلٹ گیا۔ میری قانونی چارہ جوئی اور اجمل خٹک کی راہ نمائی میں جب معزز عدالت کے خصوصی احکامات پر پولیس نے ارشد وارثی کی تلاش میں مختلف مقامات پر چھاپے مارے تو ایک جگہ سے وہ گرفت میں آ گیا۔ واقعی، اگر پولیس چاہے تو پھر کوئی بھی مجرم اس کی نظر سے بچ نہیں سکتا!

پولیس کی تفتیش کا زاویہ، استغاشہ کے گواہ الیاس کے انکشاف کے بعد چونکہ تبدیل ہو چکا تھا لہذا ان کے حرکت میں آتے ہی سارا معاملہ صاف ہو گیا۔ پولیس نے اپنی کسٹڈی میں ارشد کی ایسی شاندار ”خاطر تواضع“ کی کہ اس نے اگلے پچھلے سارے جرائم کا اقبال کر لیا۔ جس میں اس کیس کے حوالے سے سب سے اہم اقبال جرم یہ تھا کہ رئیس کو اسی نے قتل کیا تھا۔

واقعات کے مطابق، وقوعہ کے روز مقتول نے اسے ایک جگہ دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ ارشد وارثی مقتول کی نظر بچا کر تو ایک طرف نکل گیا تھا لیکن غیر محسوس انداز میں تعاقب کرتے ہوئے وہ مقتول کے فلیٹ تک پہنچ گیا۔ ارشد وارثی کو یقین تھا کہ مقتول اس کے بارے میں ملزم کو ضرور اطلاع دے گا۔ وہ مقتول اور ملزم کی دوستی سے اچھی طرح واقف تھا۔ مقتول کا واقعی یہی ارادہ تھا اور وہ جوش و جذبات میں اپنے فلیٹ کا بیرونی دروازہ لاک کر نا بھول گیا تھا لہذا ارشد وارثی کو اس فلیٹ کے اندر داخل ہونے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ بہ آہستگی چلتے ہوئے ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہ لمحات تھے جب مقتول فون پر اجمل خٹک کو کسی سر پرانز کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ادھر مقتول نے ریسپور کریدل پر رکھا، ادھر ارشد وارثی نے اسے ریوالور کے نشانے پر رکھ لیا۔ وارثی یہ تو جان گیا تھا کہ تھوڑی دیر میں خٹک وہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ بس، اسے خٹک کے وہاں آ کر واپس جانے کا انتظار کرنا تھا، اس کے بعد وہ رئیس

کوٹھکانے لگا کر فرو چکر ہو جاتا وہ چونکہ خٹک کا مجرم تھا اسی لیے وہ خٹک کو اس مصیبت میں پھنسا کر خود کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ جب خٹک مقتول کے فلیٹ پر پہنچا تو ارشد وارثی نے رئیس کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ایک ویزر پر دے کے پیچھے چھپا لیا تھا اور اس کے جاتے ہی.....!

پولیس کی تفتیش کے دوران ہی یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ اس نے خٹک کے ساتھ جو بیس لاکھ کا فراڈ کیا تھا، وہ رقم اس کے کسی کام نہ آ سکی۔ وہ سنگاپور میں رک کر امریکا جانے کی کوشش کرتا رہا اور رقم تیزی سے ختم ہوتی چلی گئی۔ انہی دنوں سنگاپور کے چند جرائم پیشہ افراد سے اس کی مدد بھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے وارثی کی باقی ماندہ رقم بھی ہتھیالی اور اسے ایک سنگین لفزے میں پھنسا کر جیل بھجوا دیا۔ وقوعہ سے کچھ دن پہلے ہی وہ سنگاپور کی جیل سے چھوٹ کر پاکستان آیا تھا اور ابھی روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا کہ مقتول کی اس پر نہ صرف نظر پڑ گئی بلکہ اس نے فراڈ یا ارشد وارثی کو شناخت بھی کر لیا تھا..... اس شناخت کے بعد ہی یہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اجمل خٹک کی باعزت رہائی کے بعد جب وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تو اکمل خٹک مجھے پارکنگ تک چھوڑنے آ گیا۔ میں نے کہا۔
”اکمل صاحب! آپ میری کارکردگی سے تو مطمئن ہیں نا؟“
”جناب آپ کی کارکردگی تو لا جواب رہی ہے۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔
”لیکن میں سمجھتا ہوں، اجمل خٹک کی رہائی میں آپ کی کوشش کے علاوہ اوپر والے کا بھی ہاتھ ہے۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”اکمل صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس دنیا کا قانون اپنی جگہ لیکن اوپر والے کا بھی ایک اپنا قانون ہے جس کی عدالت میں سفارش چلتی ہے اور نہ ہی رشوت کام آتی ہے۔ اسے کسی وکیل کے دلائل سننے کی بھی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ بس..... فیصلہ صادر کرتا ہے اور کسی میں مجال نہیں کہ اس کے فیصلے کے سامنے دم مار سکے!“

”اجمل خٹک بہت گھبرا گیا تھا مرزا صاحب!“ اکمل خٹک نے اپنے بھائی کی کیفیت کے بارے میں بتایا۔ ”آپ نے بروقت اسے قانونی اور اخلاقی سہارا دیا تو یہ معاملہ آسانی سے منٹ گیا۔“

”ایک اچھے وکیل کا فرض ہے کہ وہ اپنے موکل کو ہر سطح پر سہارا دے۔“ میں نے ٹھہرے

ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ورنہ پھر وکیل کرنے کا فائدہ ہی کیا!“
 اس نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا۔ میرا شکریہ ادا کیا اور گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد
 رخصت ہو گیا۔
 میں تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔



جان لیوا

عورت کو اپنی پریشانی بیان کرنے کے لیے زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ ہی سب کچھ بتا رہا تھا لیکن میں ایک عملی آدمی ہوں اور میرا پیشہ زبان کے استعمال پر زور دیتا ہے لہذا میں اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اسی لیے جب وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی تو رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”جی فرمائیں..... میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ زاہد کو بچالیں وکیل صاحب!“ وہ منت ریز لہجے میں بولی۔
 ”زاہد.....!“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ زاہد کون ہے؟“

”زاہد میرے شوہر کا نام ہے..... زاہد حسین!“ اس نے جواب دیا۔
 ”اور آپ.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ میرے مطلب تک پہنچتے ہوئے جلدی سے بولی۔ ”میرا نام ثانیہ ہے.....!“

ثانیہ کی عمر اٹھائیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ پست قامت، گوری رنگت اور جسم دبلا پتلا۔ وہ عام سی شکل و صورت کی حامل تھی۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہوگی۔ میں نے رف پیڈ اور پین سنجال لیا پھر اپنے سامنے بیٹھی پریشان حال ثانیہ سے پوچھا۔

”آپ کے شوہر کو کیا ہوا ہے..... میں اسے کس چیز سے بچالوں؟“
 ”زاہد کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے.....“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور استفسار کیا۔ ”کس جرم میں؟“

”اس پرتل کا الزام لگایا جا رہا ہے۔“ ثانیہ نے بتایا۔

”آپ کے شوہر زہد نے کس کو قتل کر دیا.....“

”زہد نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”وہ

قاتل نہیں ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔“

”میرے پوچھنے کا مقصد بھی یہی تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”زہد پر

کس شخص کو قتل کرنے کا الزام لگایا جا رہا ہے؟“

”خالد نظامی.....!“

”خالد نظامی سے آپ کے شوہر کا کیا تعلق تھا؟“

میں ثانیہ سے سوال کرنے کے دوران میں رف پیڈرٹس بھی لیتا جا رہا تھا۔ میرے

استفسار کے جواب میں اس نے بتایا۔

”خالد نظامی اور زہد ایک ہی کمپنی میں ملازم ہیں..... بلکہ تھے۔“ ایک لمحے کا توقف کر

کے اس نے ایک بو جھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”خالد نظامی اب اس دنیا

میں نہیں رہا اور زہد کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ”زہد اس کمپنی میں کیا کام

کرتا تھا اور مقتول کی کیا حیثیت تھی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ مذکورہ کمپنی کا نام کیا ہے؟“

”کمپنی کا نام تو ہے ”خان ٹریڈرز۔“ ثانیہ نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ امپورٹ وغیرہ کا

کام کرتے ہیں۔ خالد نظامی اس کمپنی میں جنرل مینجر تھا اور زہد.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف

ہوئی پھر تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ ”زہد اوپر کے کام کرتا تھا۔ کمپنی نے تو اسے ”آفس بوائے“ کی

پوسٹ پر رکھا ہوا تھا۔ آپ چر اسی سمجھ لیں.....“

”ہوں.....!“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”زہد اور خالد نظامی میں کوئی دشمنی وغیرہ تو

نہیں چل رہی تھی؟“

”نہیں جناب.....“ اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”ایسی کوئی بات

میرے علم میں تو بالکل نہیں ہے۔“

”آپ کے علم میں نہیں ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا

مطلب ہے، ایسا کچھ ہو سکتا ہے!“

”اگر ایسی کوئی بات، کوئی ناراضی یا کوئی دشمنی ہوتی تو زاہد مجھ سے ضرور ذکر کرتا۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں تو سمجھتی ہوں، زاہد ایک خوش اخلاق اور امن پسند انسان ہے، لڑائی جھگڑے سے دور بھاگنے والا۔ میری معلومات کے مطابق آفس میں ہر شخص کے ساتھ اس کے اچھے اور خوشگوار تعلقات ہیں.....“

”آپ کا شوہر دنگے فساد سے دور رہنے والا انسان ہے۔“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”آفس کے تمام لوگوں کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم ہیں پھر پولیس نے کن وجوہات کی بنا پر اسے خالد نظامی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے.....؟“ وہ متذبذب نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ثانیہ صاحبہ! میں آپ کی پریشانی کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ آپ اپنے شوہر کے لیے بے حد فکر مند ہیں۔ مجھے آپ کی مصیبت کا اندازہ بھی ہے لیکن اس کیس میں ہاتھ ڈالنے سے قبل میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ میں آنکھ بند کر کے کوئی کیس نہیں لیتا چنانچہ.....“ میں سانس لینے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چنانچہ، میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ خالد نظامی کے قتل کے سلسلے میں پولیس نے زاہد پر ہی کیوں ہاتھ ڈالا اور ہاں.....!“

میں نے پھر توقف کیا اور پوچھا۔ ”یہ جاننا تو میں بھول ہی گیا کہ خالد نظامی کو کب اور کہاں قتل کیا گیا ہے؟“

”خالد نظامی کو دفتر میں، اس کے کمرے کے اندر قتل کیا گیا ہے۔“ ثانیہ نے جواب دیا۔ ”اور یہ کل شام کا واقعہ ہے جبکہ..... زاہد کو آج گرفتار کیا گیا ہے۔“

”زاہد کو کتنے بجے اور کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

”آج صبح نو دس بجے کے قریب پولیس دندناتے ہوئے ہمارے گھر میں داخل ہوئی۔“

ثانیہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت زاہد آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ انہوں نے کسی سوال جواب کے بغیر اسے گرفتار کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی،

لمحاتی توقف کے بعد اس نے مزید بتایا۔

”اس صورت حال نے مجھے بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ میں بھاگ بھاگ تھانے پہنچی۔ وہاں سے مجھے صرف اتنا پتا چلا کہ زاہد نے اپنی کمپنی کے جنرل منیجر خالد نظامی کو قتل کر دیا ہے۔ میں تھانے سے زاہد کے آفس آئی اور وہیں سے مجھے باقی کی باتیں پتا چلی ہیں۔“

”ہاں وہی..... وہی باقی کی باتیں میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے علم میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جو بھی بات ہے، وہ مجھے بتائیں تاکہ میں اس معاملے کو سمجھ سکوں۔ میں اگر اس کیس کو سمجھ جاؤں گا تو بہتر طور پر آپ کی اور آپ کے شوہر کی مدد کر سکوں گا۔ شاباش..... میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ بولتی جائیں۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب! میں آپ کو پوری تفصیل سے بتاتی ہوں.....“ اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ انٹرکام کا بزرخ اٹھا۔

میں نے انٹرکام سیٹ کی طرف دیکھا۔ یہ کال یقیناً میری سیکریٹری ہی کی تھی۔ جب میرے چیمبر میں کوئی کلائنٹ موجود ہوتا تو عموماً وہ مجھے کال نہیں کیا کرتی تھی، ایمر جنسی یا ضروری کام کی بات الگ ہے۔ میں نے ریسپونڈ کرنا سے لگا دیا اور کہا۔

”ہیلو.....!“

”سر! کوئل، می کے پاس جانے کی ضد کر رہی ہے۔“ میری سیکریٹری نے بتایا۔

اس کی بات سن کر میں الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کسی کوئل اور اس کی می کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟“

میرے اس استفسار پر ثانیہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اسی لمحے سیکریٹری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”سوری سر! میں دراصل اس بچی کی بات کر رہی ہوں جس کی می اس وقت آپ کے چیمبر میں موجود ہیں۔ اس بچی کا نام کوئل ہے۔ یہ خاتون آپ کے پاس جاتے ہوئے بچی کو زینٹنگ لابی ہی میں بٹھا گئی تھیں اور اب وہ ضد کر رہی ہے کہ اپنی می کے پاس جانا ہے.....“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”آپ اس بچی کو

اندر لے آئیں۔“

”او کے سر.....!“

میں نے ریسپور کو کریڈل کرتے ہوئے ثانیہ سے پوچھا۔ ”آپ اپنی بچی کو بھی ساتھ لائی تھیں؟“

”ہاں.....“ اس نے اضطرابی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی پھر پوچھنے لگی۔ ”کیا ہوا ہے میری کول کو؟“

”کچھ نہیں ہوا!“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ آئی تھیں تو اسے بھی اندر لے آئیں۔ وہ آپ کے پاس آنے کو مچل رہی ہے۔“

”میں نے سوچا تھا، دس پندرہ منٹ میں فارغ ہو جاؤں گی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یہاں تو ابھی اور بھی دیر لگے گی.....!“

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں نے آپ کی کول کو یہیں بلا لیا ہے۔“

”شکریہ دیکھیں صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

اسی وقت میری سیکریٹری، کول نامی اس بچی کو میرے چیمبر میں لے آئی۔ کول دھان پان سی ایک سانولی سلونی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک خاص قسم کی جاذبیت پائی جاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق، کول کی عمر آٹھ سال کے قریب رہی ہوگی۔

سیکریٹری کول کو چیمبر میں پہنچا کر واپس چلی گئی تو ثانیہ نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا کر بٹھالیا۔ میں نے ثانیہ سے پوچھا۔

”آپ کے کتنے بچے ہیں؟“

”صرف ایک..... یہی کول!“

”ماشاء اللہ! آپ کی بچی اسم با مسمیٰ ہے!“ میں نے تعریفی انداز میں کول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ ثانیہ نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”کول کیا ہے.....؟“

”اسم با مسمیٰ!“ میں نے جواب دیا۔ ”یعنی اپنے نام پر پوری اترنے والی۔ کول کول سی،

نرم و نازک اور پیاری پیاری سی.....!“

”اوہ..... شکریہ وکیل صاحب!“ ثانیہ نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ”ہماری دنیا تو اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔“

”یقیناً..... ماں باپ کو اپنی اولاد کے حوالے سے اسی انداز میں سوچنا چاہیے۔“
ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک کوئل اور اس کی پڑھائی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر ہم اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ میں نے ثانیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آپ مجھے زاہد حسین کے بارے میں کچھ تفصیل بتانے والی تھیں!“

”جی.....“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”تو شروع ہو جائیں۔“ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

اور وہ شروع ہو گئی.....

اس روز ثانیہ نے مجھے اپنے شوہر اور اس کے دفتر کے حالات کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا، وہ خاصا طویل ہے۔ میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آگے بڑھتے اور آگے پڑھتے ہوئے آپ کو کوئی الجھن محسوس نہ ہو.....!“



”خان ٹریڈرز“ کا آفس ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں واقع تھا جو شارع فیصل پر لال کوٹھی اور بلوچ کالونی کے درمیان استادہ تھی۔ اس عمارت کی کل چھ منزلیں تھیں یعنی گراؤنڈ پلس فائو..... اور ”خان ٹریڈرز“ تھریڈ فلور بہ الفاظ دیگر چوتھی منزل پر تھا۔ یہ پورا فلور ہی متذکرہ بالا کمپنی کے تصرف میں تھا۔

”خان ٹریڈرز“ بنیادی طور پر امپورٹ کا کام کرتی تھی۔ یہ کمپنی جنرل آرڈر سپلائرز بھی تھی تاہم اسٹاک کے شعبے سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ لوگ پارٹی سے آرڈر لیتے پھر مطلوبہ آئٹم کو بیرون ملک سے منگوا کر سیدھا پارٹی تک پہنچا دیتے تھے لہذا اس کثیر المنزلہ عمارت میں صرف اور صرف دفتری کام ہوتا تھا۔

مگر زاہد حسین کو اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ چھ سال ہو گئے تھے۔ وہ واجبی

ساکھ پڑھا تھا۔ کوئی افسرانہ کام تو اسے نہیں مل سکتا تھا تاہم وہ بہت سے ایسے کام بہ آسانی وہ خوبی کر لیتا تھا جو افسران کے درجے کے ہوتے تھے۔ مذکورہ کمپنی میں اس کا عہدہ ”آفس بوائے“ کا تھا، اوپر کے تمام کام اسی کے ذمے ہوتے تھے مثلاً چائے بنانا اور پلانا، پانی پلانا، اسٹاف کو لُنج کرانا، سوئیچر سے اپنی نگرانی میں صفائی کرانا اور بعد ازاں تمام کرسیوں میزوں وغیرہ کی ڈسٹنگ کرنا، باہر سے فوٹو کاپی کرانا، بینک میں چیک جمع کرانا وغیرہ وغیرہ..... اور اس پر بھی وہ آفس بوائے تھا!

”آفس بوائے“ بھی بڑا عجیب و غریب عہدہ ہے۔ حامل ہذا چاہے پچاس برس کا ہو، وہ بوائے ہی رہتا ہے.....! ”خان ٹریڈرز“ کا مالک سعد اللہ خان نفیس طبع اور بخیدہ بزنس مین تھا۔ وہ طویل عرصے سے اس کمپنی کو چلا رہا تھا۔ مارکیٹ میں اس کی ایک قابل بھروسہ ساکھ تھی۔ اس کی کمپنی کا نام معتبر جانا جاتا تھا۔ سعد اللہ خان کی رہائش ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں تھی۔

دیگر اسٹاف میں، عارف محمود اکاؤنٹس اور کیش کوڈیکھتا تھا۔ نادرہ مجید کمپنی کی ڈائریکٹر تھی اور مقتول خالد نظامی جنرل منجبر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ لٹنی سلیم نامی ایک خوب رو اور طرح دار خاتون ریسپشن پر ہوتی تھی جو ریسپشنسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیلی فون آپریٹر بھی تھی اور..... اس مختصر سے آفس اسٹاف کا آخری رکن، اس کیس کا ملزم اور میرا موکل زاہد حسین..... تھا۔

”خان ٹریڈرز“ کے عمومی اوقات کا رومج دس بجے سے شام چھ بجے تک تھے لیکن اکثر لوگ سوائے ملزم کے، گیارہ بجے تک ہی آفس پہنچتے تھے۔ زاہد حسین کو دس بجے تک آفس پہنچنا ہوتا تھا۔ آفس وہی کھولتا تھا اور اپنی نگرانی میں سوئیچر سے صفائی وغیرہ کرواتا تھا۔ گرفتاری کے روز، وہ دفتر جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ پولیس اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ زاہد کی رہائش منظور کالونی میں تھی اور وہ عموماً ٹھلٹے ہوئے ہی دفتر آ جاتا ہے۔ اس کے گھر اور دفتر کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

مقتول خالد نظامی کی رہائش سمن آباد میں تھی جہاں وہ اپنی بیوی شائستہ اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا عمران پچیس سال کا تھا۔ اس سے چھوٹی دو بیٹیاں شازیہ اور فائزہ تھیں جن کی عمریں بالترتیب اٹھارہ اور پندرہ سال تھیں۔ مقتول اکثر و بیشتر لیٹ سٹنگ کرنے کا عادی تھا لیکن وہ زیادہ سے زیادہ نو، ساڑھے نو بجے رات تک گھر پہنچ جایا کرتا تھا لیکن وقوعہ کے روز ایسا نہیں ہو سکا تھا۔

واقعات کے مطابق، گیارہ اکتوبر کی رات جب مقتول دس بجے تک بھی اپنے گھر نہیں

پہنچا تو اہل خانہ کو اس کے بارے میں تشویش ہوئی۔ اس کی بیوی شائستہ نے سب سے پہلے دفتر فون کیا لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ دفتر میں کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مقتول دفتر سے نکل چکا ہے۔ شائستہ نے مزید آدھا گھنٹہ اپنے شوہر کا انتظار کیا پھر وہ فکر مند ہو گئی۔

مقتول کو جب بھی زیادہ دیر تک دفتر میں رکنا ہوتا تھا تو وہ چھ بجے کے قریب فون کر کے اپنی بیوی کو اس بارے میں بتا دیا کرتا تھا لیکن آج ایسا نہیں ہوا تھا اور شائستہ کی پریشانی کا سبب بھی یہی تھا۔ وہ ٹیلی فون سیٹ کے قریب ہی بیٹھ گئی اور مقتول کے تعلق داروں اور دوستوں کو باری باری فون کر کے اس کے بارے میں پوچھنے لگی حتیٰ کہ اس نے آفس کو لیکز کو بھی چیک کر لیا مگر اس کی پریشانی میں کوئی کمی واقع نہ ہو پائی۔ سب نے یہ کہہ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”بھابی! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ خالد کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے۔ وہ گھر آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے راستے میں کہیں رک گیا ہو.....!“

لیکن شائستہ کے دل کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ برے برے خیالات اسے ڈرا رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ معمول پر نہیں ہے۔ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے جو خالد ابھی تک گھر نہیں پہنچا۔ آفس کو لیکز نے بتایا تھا کہ جب وہ دفتر سے رخصت ہوئے تو خالد نظامی اور آفس بوائے زاہد حسین دفتر میں موجود تھے۔ اکاؤنٹنٹ عارف محمود سے پتا چلا تھا کہ وہ چھ بجے اپنی سیٹ سے اٹھا تھا اور اس وقت مقتول کے کمرے میں اس کا کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے رات شائستہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے عمران کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ”میں نے ہر جگہ فون کر کے پتا چلانے کی کوشش کی ہے لیکن تمہارے پاپا کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ اب تمہیں میدان میں اترنا ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے.....“

”آپ پریشان نہ ہوں می! عمران نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں بائیک لے کر نکلتا ہوں اور پاپا کو ڈھونڈ کر ہی لاؤں گا۔“

”شاباش.....!“ شائستہ نے امید بھری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”تم اپنی تلاش کا آغاز کہاں سے کرو گے؟“

”جہاں پاپا صبح گئے تھے۔“ عمران نے پراعتماد لہجہ میں کہا۔ ”میں سب سے پہلے ان کے آفس جاؤں گا۔“

”لیکن آدھی رات کو تو آفس بند ہوگا۔“ شائستہ نے الجھن زدہ نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ ”بلکہ اس بلڈنگ میں تو ایک دم سناٹا ہو رہا ہوگا!“

”آپ نے ہراس جگہ فون کر کے دیکھ لیا تا جہاں پاپا پائے جاسکتے تھے۔“ عمران نے مدلل انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے، ان کے آفس جانے سے کوئی ایسا سرایا سراغ ہاتھ لگ جائے جس سے ان کی تلاش آسان ہو سکتی ہو..... کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“

”کوئی حرج نہیں ہے۔“ بڑی بہن شازیہ نے کہا۔ ”ممی! عمران بالکل صحیح سمت میں سوچ رہا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھے رہنے سے تو اچھا ہے، پاپا کو تلاش کرنے کی تگ و دو کی جائے۔“

”میں تو کہتی ہوں، ہمیں پولیس اسٹیشن فون کر کے پاپا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر دینا چاہیے۔“ چھوٹی بہن فائزہ جو نویں کلاس کی طالبہ تھی، نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”آج کل تو اغوا برائے تاوان وغیرہ کے بھی بہت واقعات سننے میں آ رہے ہیں۔“

”تم اپنا فلسفہ فی الحال اپنے پاس ہی رہنے دو۔“ شازیہ نے چھوٹی بہن کو ڈانٹ دیا۔

”ہمارے ذہن پہلے ہی بہت الجھے ہوئے ہیں.....!“

”ہوں.....!“ فائزہ نے ایک خاص انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فائزہ اپنے بہن بھائیوں سے بالکل مختلف تھی۔ سوچوں میں گم رہنے والی ایک سنجیدہ لڑکی۔

فائزہ کے کمرے سے اٹھتے ہی شائستہ نے بے ساختہ کہا۔ ”اغوا برائے تاوان..... اونہہ، پاگل کہیں کی! کوئی جرائم پیشہ شخص اس مقصد کے لیے خالد کو کیوں اغوا کرے گا۔ ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ سوکھی تنخواہ پر تو گزارہ ہو رہا ہے۔ اگر اغوا کرنا اتنا ہی ضروری ہوگا تو کوئی جیالا خالد کے پاس سعد اللہ پر ہاتھ ڈالے گا جہاں سے موٹی رقم مل سکتی ہے.....!“

شائستہ کا یہ تبصرہ اگرچہ غیر ارادی طور پر سامنے آیا تھا لیکن بلاشبہ، ان الفاظ میں اس کے

دلی جذبات بھی شامل تھے۔ وہ خالد نظامی کے پاس سعد اللہ خان سے ناخوش تھی جو خالد کو اس کی محنت کے برابر تنخواہ نہیں دے رہا تھا اور..... ”سوکھی تنخواہ“ کے الفاظ نے اس لیے طنز کی چادر اوڑھ رکھی تھی کہ مقتول ایک ایماندار شخص تھا۔ ادھر ادھر کی ”آمدنی“ پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ شائستہ کو اپنے شوہر سے تو جوش کایات تھیں، سو تھیں علاوہ ازیں سعد اللہ خان کے لیے اس کا دل و دماغ اس لیے غم و غصے سے بھر رہا تھا کہ اسے مقتول کا بالکل خیال نہیں تھا جو اتنی کم تنخواہ دیتا تھا۔

عمران نے اپنی بہنوں اور ماں کو تسلی دی پھر بایک پر سوار ہو کر اپنے پاپا کی تلاش میں نکل گیا۔ سمن آباد سے شارع فیصل اچھے خاصے فاصلے پر ہے۔ وہ آدھی رات کے بعد اس بلڈنگ کے سامنے پہنچ گیا جس کے تھرڈ فلور پر ”خان ٹریڈرز“ کا آفس واقع تھا۔ جب وہ بلڈنگ کے سامنے بایک کھڑی کر رہا تھا تو ایک چیز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا اور وہ چیز تھی نیوی بلیو مزدا کار!

سیکنڈ کے دسویں حصے میں وہ شناخت کی تمام منازل طے کر کے اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ گاڑی اس کے پاپا کی تھی۔ اس کے ذہن نے تیز رفتاری سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اگر گاڑی بلڈنگ کے سامنے موجود تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ پاپا آفس میں ہوں گے۔

اس منطقی خیال نے اس کی سوچ کو الجھا دیا۔ شائستہ نے متعدد بار آفس فون کر کے خالد نظامی کی خیریت دریافت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فون ایک مرتبہ بھی اٹینڈ نہیں ہوا تھا۔ یہ بات قابل غور اور تشویش ناک تھی کہ اگر خالد آفس میں موجود تھا تو پھر فون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا اور..... اتنی لیٹ سٹنگ کے بارے میں اس نے گھر میں کیوں نہیں بتایا تھا؟

انہی سنسنی خیز خیالات کے ساتھ عمران بلڈنگ کے چوکیدار کے پاس پہنچ گیا۔ چوکیدار سردار علی اسے پہچانتا تھا۔ جب عمران نے اپنے پاپا کے حوالے سے اس سے استفسار کیا تو سردار علی نے واضح الفاظ میں بتایا۔

”اوپر تو کوئی بھی نہیں۔ آفس بند پڑا ہے۔“

”آفس بند پڑا ہے تو پاپا کہاں چلے گئے؟“ بے ساختہ عمران کے منہ سے نکلا۔

سردار علی نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا نظامی صاحب گھر نہیں پہنچے؟“

”اگر پاپا گھر پہنچ جاتے تو میں انہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں کیوں آتا؟“

”مگر یہاں سے تو سب جا چکے ہیں۔“ چوکیدار نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”صرف“ خان ٹریڈرز“ ہی نہیں بلکہ تمام دفاتر بند ہیں۔ میرے سوا اس بلڈنگ میں کوئی بندہ بشر موجود نہیں.....“

”کیا تم نے اپنی آنکھوں سے پاپا کو بلڈنگ سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا؟“ عمران اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مستفسر ہوا۔ اس کے انداز میں اچھی خاصی جارحیت پائی جاتی تھی۔

”میں نے اپنی آنکھوں سے تو انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ چوکیدار نے متذہب نظر سے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”جب وہ بلڈنگ سے نکلے اس وقت میں گیٹ پر موجود نہیں تھا۔“

سردار علی کی وضاحت پر عمران خاصے بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جب تم نے پاپا کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا تو پھر میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ جا چکے ہیں، خاص طور پر..... جب ان کی گاڑی بھی ادھر ہی موجود ہو!“

”گاڑی.....!“ چوکیدار نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا۔ ”اس گاڑی کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ کسی خرابی کے باعث گاڑی یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی گاڑی میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو وہ کسی اور ذریعے یعنی ٹیکسی رکشا سے گھر چلا جاتا ہے.....“

”اول تو یہ کہ پاپا کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ گاڑی دفتر کے پاس چھوڑ گئے ہوں۔“ عمران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اگر ان کی گاڑی میں کوئی گڑبڑ ہو بھی گئی تھی تو انہیں کسی بھی ذریعے سے گھر تو پہنچنا چاہیے تھا۔ اس صورت میں، میں انہیں تلاش کرتے ہوئے آدھی رات کو یہاں نہ آتا۔“ وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں جب تک اوپر جا کر دیکھ نہیں لوں گا، میری تسلی نہیں ہوگی۔ تم آؤ میرے ساتھ، ہم اوپر جا رہے ہیں۔“

”آ میں جی.....“ سردار علی نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ”ویسے تو پوری بلڈنگ خالی ہے۔ میں نے ایک ایک آفس چیک کر لیا ہے لیکن اگر آپ کی تسلی اوپر جا کر ہی ہوتی ہے تو میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔“

رات کو جب تمام دفاتر بند ہو جاتے تھے تو چوکیدار صرف کوریڈورز کی لائٹس آن کر کے نیچے آ جایا کرتا تھا پھر اگلی صبح تک اسے اوپر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن خالد نظامی کی پراسرار کشدگی ایسا معاملہ تھا کہ وہ عمران کے ساتھ اوپر جانے پر مجبور ہو گیا۔ مذکورہ بلڈنگ میں لفٹ بھی لگی ہوئی تھی تاہم اس وقت وہ زینے کے ذریعے ہی اوپر جا رہے تھے۔

سردار علی نے اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ ”آپ نے دفتر کے دوسرے لوگوں کو فون کر کے نظامی صاحب کے بارے میں پوچھایا نہیں؟“

”سب سے پوچھ لیا ہے۔“ عمران نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”تمام دوستوں، رشتے داروں اور آفس والوں کو چیک کر چکے ہیں۔ کسی کو بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ سب طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں یہاں آیا ہوں۔ نیچے ان کی گاڑی دیکھ کر مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ آفس ہی میں ہوں گے۔“

سردار علی نے ایسی نظر سے عمران کی طرف دیکھا جیسے اس کے سر پر دو سنگ نکل آئے ہوں۔ وہ نوجوان ایسی بات کر رہا تھا جو چوکیدار کے ذہن کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ وہ عمران کے یقین کی جواب میں گہری سنجیدگی سے بولا۔

”بیٹا! میں آپ کی تسلی کی خاطر دفتر چیک کرنے اوپر آ گیا ہوں لیکن مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں کہ نظامی صاحب کیا، کوئی بھی اس وقت دفتر کے اندر موجود ہو۔ میں سب لوگوں کے جانے کے بعد ایک ایک دفتر کو چیک کرتا ہوں پھر ہی نیچے ڈیرا لگاتا ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی.....“ بولتے بولتے چوکیدار متذبذب انداز میں خاموش ہو گیا تو عمران نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔

”کون سی بات؟“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس بلڈنگ میں مختلف کمپنیوں کے دفاتر ہیں جن میں درجنوں افراد کام کرتے ہیں۔ جب کبھی کسی کو گاڑی یہاں چھوڑ کر جانا ہوتا ہے تو وہ مجھے ضرور بتا دیتا ہے تاکہ میں اس گاڑی کا خاص طور پر خیال رکھوں لیکن نظامی صاحب تو جاتے ہوئے مجھ سے مل کر بھی نہیں گئے اور نہ ہی کسی اور طرح اپنی گاڑی کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا، یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

اسی بات چیت کے دوران میں وہ زینے طے کرتے ہوئے تھرڈ فلور پر پہنچ گئے۔
کورڈور میں لائٹ روشن تھی۔ سردار علی، عمران کو ”خان ٹریڈرز“ کے داخلی دروازے کے سامنے پہنچا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”دیکھ لیں، دروازہ بند ہے!“

عمران نے محض ”دیکھنے“ پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ اپنے باپ کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور نیچے کھڑی خالد نظامی کی گاڑی کو دیکھ کر اس کا ذہن ایک خاص انداز میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ ہر قدم پر تسلی چاہتا تھا لہذا وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بند دروازے کے لٹوکو گھمانے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کی یہ کوشش پلک جھپکتے میں کامیاب ہو گئی۔ جیسے ہی اس نے لٹوکو گھمانے کے لیے زور لگایا، وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھوم گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے بند کرتے وقت مخصوص ناب دبا کر لاک نہیں کیا گیا تھا۔ فلش ڈور پر چونکہ الگ سے عام تالا نہیں ڈالا جاتا اس لیے جب تک لٹو (مخصوص پینڈل) کو گھما کر نہ دیکھا جائے، یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ لاک ہے یا کھلا ہوا ہے۔

عمران نے الجھن زدہ نظر سے سردار علی کی طرف دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔
”تم نے تو تمام دروازے چیک کر لئے تھے اور تمہارا دعویٰ ہے کہ اس بلڈنگ کے کسی دفتر میں کوئی شخص موجود نہیں پھر..... پھر.....“ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”پھر یہ دروازہ کیسے کھلا ہوا ہے..... اور اگر دروازہ کھلا ہے تو اس کا مطلب ہے.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر دفتر کے اندر داخل ہو گیا۔

مذکورہ دفتر بلڈنگ کی ایسی پوزیشن پر واقع تھا کہ اس کے مختلف کمروں کی کھڑکیاں عقبی جانب کھلتی تھیں یعنی مین شارع فیصل سے اس کی کسی کھڑکی کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو بہت پہلے چوکیدار کو کسی گڑبڑ کا احساس ضرور ہو جاتا کیونکہ دفتر کے اندر آدھی سے زیادہ لائٹس آن تھیں تاہم روشن کھڑکیاں چونکہ عقبی جانب پڑتی تھیں لہذا اس غیر معمولی امر کی طرف سردار علی کا دھیان نہیں گیا تھا۔

چوکیدار بھی اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ”میں نے تو تمام دروازوں کے ہینڈل گھما کر دیکھے تھے۔ پتا نہیں، یہ کیسے رہ گیا۔ زاہد کو میں نے خود جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر میں یہی سمجھا کہ شاید دفتر بند ہو گیا ہے کیونکہ زاہد سب سے آخر میں جاتا تھا اور اس وقت مجھے کوئی بھی بشر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر.....!“

عمران اس کی بڑبڑاہٹ پر دھیان دیے بنا تیزی سے آگے بڑھا اور مخصوص راہداری میں سے ہوتے ہوئے وہ اپنے باپ کے کمرے تک پہنچ گیا۔ کمرے کی لائٹس آن تھیں حتیٰ کہ وہاں کا اے سی بھی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا اور اس ٹھنڈے ٹھار روشن ماحول میں ایک منظر نے عمران کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

وہ وحشت ناک منظر تھا اس کے پا پا کی لاش کا.....!

پہلی نظر ہی میں عمران کو یقین ہو گیا کہ اس کا پا پا خالد نظامی زندگی سے خالی ہو چکا ہے۔ مقتول یعنی اس کی لاش اس وقت کرسی پر اس طرح موجود تھی کہ اس کا سر میز پر بڑے بے ڈھنگے انداز میں ایک سائیڈ پر ٹکا ہوا تھا۔ چہرے کا بایاں حصہ، بائیں کان کے بل میز سے پیوست تھا اور اوپری حصہ دائیں جانب ایک خوف ناک منظر پیش کر رہا تھا اور اس ہول ناک کامرکز مقتول کی گردن تھی جو کان سے ایک، ڈیڑھ انچ نیچے آگے پیچھے کٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کسی تیز دھار آلے کی مدد سے مقتول کی گردن پر کچھ ایسی پھرتی اور مہارت سے وار کیا گیا تھا کہ آدھی سے زیادہ گردن کٹ گئی تھی۔ یہ مہلک وار یقیناً اس وقت کیا گیا تھا جب مقتول اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور گردن کٹنے کے بعد اس کا سر ایک جھٹکے سے میز پر آ رہا۔ موت کے اس منظر سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ مقتول خالد کو اس جہان سے اس جہان میں منتقل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا ہوگا۔ اس کے بدن نے ایک دو خطرناک جھٹکے کھائے ہوں گے اور..... بس!

اگر مقتول کا سر میز پر نہ جائلتا تو ممکن تھا، یہ خطرناک جھٹکے اسے کرسی سے نیچے لٹھکا کر فرش پر پہنچا دیتے۔ خالد نظامی کی لاش تو فرش تک نہیں پہنچ سکی تھی البتہ اس کی نصف کٹی ہوئی گردن سے خارج ہوانے والے خون نے قالین پوش فرش کو جا بہ جاداغ دار کر دیا تھا۔ یہ ایک ہولناک سے کہیں زیادہ حسرت ناک منظر تھا۔

اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا ہوگا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بہ

خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عمران کی ذہنی اور قلبی کیفیت کیا رہی ہوگی۔ اس نے سب سے پہلے گھر فون کر کے اپنی مُمی کو صورت حال سے آگاہ کیا پھر آفس میں کام کرنے والے خالد نظامی کے کولیکٹر کو کال کیا گیا۔ ”خان ٹریڈرز“ کے مالک سعد اللہ خان کو بھی فون کیا گیا۔ اس ہنگامی کارروائی کے نتیجے میں لگ بھگ چار بجے تک سعد اللہ خان، عارف محمود، نادرہ مجید اور لمبی سلیم وغیرہ جائے وقوعہ پر پہنچ چکے تھے۔ سعد اللہ خان کی آمد نے باقی افراد کو بھی گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ملزم زاہد حسین کے گھر پر چونکہ فون کی سہولت مہیا نہیں تھی اس لیے اسے کال نہیں کیا گیا۔

جب آفس کے لوگ جائے واردات پر جمع ہو گئے تو پہلی فرصت میں پولیس کو فون کیا گیا۔ متعلقہ تھانے میں سعد اللہ خان کے ذاتی مراسم تھے لہذا پولیس کو وہاں پہنچنے میں کسی قسم کی ”دشواری“ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

سب انسپکٹر قادر بخش اپنے دو ساتھی کانٹیلو کے ساتھ جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کرتا رہا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کے اس تکنیکی جائزے کے بعد اس نے موقع پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ بلڈنگ کا چوکیدار سردار علی بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ اس پوچھ تاچھ کے نتیجے میں کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں کہ پولیس کی تمام تر توپوں کے رخ آفس بوائے زاہد حسین کی جانب ہو گئے۔

زاہد حسین کو پولیس کا نشانہ بنانے میں کن پوائنٹس نے اہم کردار ادا کیا، فی الحال میں ان کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اس مقصد کے لیے آپ کو عدالتی کارروائی کے لیے تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔

میں یہ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا کہ ثانیہ کی چپتا سننے کے بعد میں نے زاہد حسین کا کیس ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اگر میں نے یہ کیس نہ لیا ہوتا تو آج آپ کو اس کی روداد نہ سنا رہا ہوتا!



اگلے روز پولیس نے ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کے ریمائنڈ کی درخواست کی۔ پولیس کا موقف بڑا جاندار تھا لہذا میں اس کے خلاف کچھ نہ کر سکا۔ خالد نظامی کو اس کے کمرے میں

بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور وقتی شواہد میرے موکل کے مجرم ہونے کی جانب اشارہ کرتے تھے لیکن میں جانتا تھا، ان وقتی شواہد کی جڑیں زیادہ مضبوط اور گہری نہیں تھیں۔ میں الزام کے اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتا تھا اور پھر یہ تو کیس کی ابتدا تھی۔ آگے دیکھنے کے لیے بہت وقت پڑا ہوا تھا۔

عدالت نے مختصر سی کارروائی کے بعد ملزم زاہد حسین کو سات دن کے ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو ثانیہ میرے ہمراہ تھی۔ آج وہ اپنی بیٹی کو مل کو ساتھ نہیں لائی تھی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے تسلی بخشی کی باتیں شروع کیں تو اس کے آنسو نکل آئے، بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”وکیل صاحب! میں نے سنا ہے، پولیس والے ریمانڈ کی مدت کے دوران میں ملزم پر بہت سختی کرتے ہیں.....!“

”ہاں، وہ سختی تو کرتے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اکثر ملزم ان کی ”خیتوں“ سے بچنے کے لیے یا پھر سختیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اقبال جرم بھی کر لیتے ہیں۔“

”چاہے جرم کیا ہو..... یا نہ کیا ہو؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”ہاں.....!“ میں نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔

”یہ تو بڑی غلط بات ہے جناب!“ وہ فکر مندی سے بولی۔ ”اگر جرم نہیں کیا اور انسان

بالکل بے گناہ ہے تو پھر..... وہ تو گیا کام سے۔ یہ اقرار جرم تو اسے سیدھا جیل بھیج دیتا ہوگا.....!“

”اب ایسا بھی نہیں ہے.....“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں وکیل صاحب؟“

”میں سمجھاتا ہوں۔“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”جب کوئی ملزم پولیس کسٹڈی میں

ہوتا ہے خصوصاً ریمانڈ کی مدت کے دوران میں تو وہ ہر جائز اور ناجائز حربہ آزما کر اس سے اقبال

جرم کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ چالان کی تیاری کے لیے بھی مختلف

نوعیت کے شواہد اور ثبوت جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ کیس کو مضبوط سے مضبوط تر بنا کر عدالت میں

پیش کیا جاسکے۔ بس، پولیس کے اختیار میں اتنا ہی ہوتا ہے۔ وہ کسی ملزم کو جیل بھجوانے کی مجاز نہیں

ہوتی۔ یہ کام عدالت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور.....“

”لیکن اگر کوئی ملزم پولیس کی تحویل میں اپنے جرم کا اقرار کر لیتا ہے تو.....“ وہ میری

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”ایسی صورت میں عدالت اسے سزا سنائے گی.....“

اس مرتبہ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”آپ نے میری بات پوری

نہیں ہونے دی۔ میں آپ کو یہی بتانے جا رہا تھا کہ پولیس کی تحویل میں کسی ملزم کے اقبال جرم کو عدالت میں اہمیت نہیں دی جاتی۔ ملزم کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ صحت جرم سے انکار کر دے۔

عدالت پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، واقعاتی شہادتوں، گواہوں کے بیانات، دونوں وکلاء کی جرح اور دلائل کی روشنی میں کسی حتمی نتیجے تک پہنچتی ہے۔ اس کے بعد ملزم کے لیے سزا کا تعین کیا جاتا ہے

لہذا.....“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو ابھی سے اتنا زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آج آفس سے اٹھنے

کے بعد متعلقہ تھانے جا کر زاہد حسین سے بھرپور ملاقات کروں گا۔ میں اسے جو ہدایات دوں گا، اگر وہ اس پر عمل پیرا ہو تو انشاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”انشاء اللہ!“ اس نے خلوص دل سے میرے الفاظ دہرائے پھر امید بھری نظر سے مجھے

دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ”آپ اگلی پیشی پر زاہد کی ضمانت کروادیں گے نا؟“

”میں پوری کوشش کروں گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن

ایک بات ذہن میں رکھیں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت عموماً ہوتی نہیں یا پھر بڑی مشکل سے ہوتی ہے اس لیے.....“ میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس لیے اگر آپ کے شوہر کی ضمانت منظور نہ کی گئی تو آپ کو حوصلہ ہارنے کی ضرورت

نہیں۔ آپ کا شوہر اگر بے گناہ ہے تو طاقتور سے طاقتور مخالف بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں اسے باعزت رہائی دلوا کر ہی رہوں گا۔“

”یہ تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ زاہد نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”قتل تو بہت زور کی بات ہے، زاہد میں تو کسی چوہے یا بلی کو مارنے کا بھی حوصلہ نہیں۔“

”بس تو پھر آپ مطمئن ہو کر گھر جائیں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اللہ نے چاہا

تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے، وکیل صاحب!“ وہ تہ دل سے بولی۔

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو

گئی۔ میں دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

اسی روز اپنی دفتری مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر جانے سے پہلے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ اگر کوئی ملزم ریمانڈ پر ہو تو پولیس والے کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے لیکن میں ایسی ”ملاقات“ کے ایک سوا ایک گرجا جانتا ہوں جن کا ذکر پہلے بھی کئی مرتبہ کیا جا چکا ہے، قصہ مختصر میں نے اس رات زاہد حسین سے بھرپور ملاقات کر لی۔

اس ملاقات میں، میں نے زاہد حسین سے وکالت نامے، ضمانت نامے کے کاغذات اور دیگر اہم پیپرز پر دستخط لے لیے۔ علاوہ ازیں اس سے گفتگو کے دوران بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ بعض گوشے نشنہ رہ گئے تھے۔ زاہد کی نظر میں ممکن ہے، مذکورہ گوشوں کی اہمیت نہ ہو لیکن میں اس کیس کو ہر زاویے سے دیکھ رہا تھا لہذا بہت سی غیر اہم اور معمولی باتوں کی بھی میرے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ میں کرید کرید کر زاہد سے سوالات کرتا رہا۔ اس دوران میں ایک کانسیبل حوالات کے اس حصے میں دو تین مرتبہ آ کر جھانک چکا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ملزم سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

میں نے رخصت ہونے سے پیشتر زاہد حسین سے کہا۔ ”تم نے مجھے دفتر کے حالات اور وہاں کی سیاست کے بارے میں تو سب کچھ بتا دیا ہے جس کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے کہ تم بے گناہ ہو۔ تمہیں کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ سب کچھ عدالت کو دکھانے اور اس سے منوائے کی ضرورت ہے۔ وہ سنی سنائی اور کبھی، بتائی ہوئی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ اسے ہر سلسلے میں ٹھوس ثبوت درکار ہوتے ہیں لہذا مجھے ایسے شواہد اور ثبوت اکٹھا کرنا ہوں گے جو تمہیں بھری عدالت میں بے گناہ ثابت کر سکیں۔ مقتول کی لاش کی پوزیشن کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے تو سمجھ لیا ہے کہ خالد نظامی کو تم نے قتل نہیں کیا لیکن یہی بات عدالت کو بھی سمجھانا ہوگی جہی وہ تمہیں بے گناہ قرار دے گی اور اس مقصد کے لیے مجھے سخت محنت کرنا ہوگی جس کے لیے مجھے کسی ایسے شخص کے تعاون کی ضرورت ہے جو تمہارے آفس کا حصہ ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ تم سے بھی دلی ہمدردی رکھتا ہو۔ میں ایسے شخص کے ذریعے چند اہم سوالات کے جوابات

حاصل کرنا چاہتا ہوں جنہیں تمہارے حق میں استعمال کروں گا۔ بتاؤ، ایسا کون ہو سکتا ہے؟“
اس نے ایک لمحہ سوچا پھر جواب دیا۔ ”میں پورے دفتر میں لپٹی صاحبہ کو اپنا سچا ہمدرد اور
خیر خواہ سمجھتا ہوں۔ وہ نہ صرف دفتری فضا اور سیاست سے اچھی طرح واقف ہیں بلکہ انہیں میرا
خیال بھی ہے۔ اگر آپ ان سے رابطہ کریں تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”تم اپنی ریسپشنسٹ کی بات کر رہے ہونا؟“ میں نے تصدیقی لہجے میں پوچھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ہاں!“

”ٹھیک ہے، میں لپٹی سلیم سے اس سلسلے میں رابطہ کروں گا۔“ میں نے پُرسوج انداز میں

کہا۔ ”اللہ کرے کہ وہ تمہارے لیے مفید ثابت ہو لیکن اس کے حوالے سے ایک مسئلہ ہے.....“

”کیسا مسئلہ؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”دفتر کی حد تک تو لپٹی سلیم یقیناً کارآمد ثابت ہو
سکتی ہے لیکن مجھے ایک ایسے آدمی کی بھی ضرورت ہے جو تمہاری خاطر اپنے قیمتی وقت سے کچھ حصہ
نکال کر میرے اشارے پر کسی چاق چوبند گھوڑے کے مانند میدان میں بھاگ سکتا ہو۔ تم میرا
مطلب سمجھ رہے ہونا؟“

”ہاں، سمجھ رہا ہوں وکیل صاحب!“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
”لیکن ایسا کوئی بندہ دفتر میں تو نہیں ہے!“

”اور دفتر سے باہر.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ چونکے ہوئے انداز میں بولا۔ ”یہ کام بابر علی کر سکتا ہے!“

”بابر علی!“ میں نے زیر لب دہرایا اور پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”بابر علی، شو بزنس کے ایک میگزین میں پروف ریڈر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔“ زاہد
حسین نے بتایا۔ ”اس میگزین کا آفس ہمارے والی بلڈنگ ہی کے فورتحہ فلور پر ہے۔ بابر سے میری
بڑی گہری دوستی ہے۔ وہ میری خاطر اپنا قیمتی وقت دے سکتا ہے۔ میں اسے اپنا سچا دوست سمجھتا
ہوں۔“

”ٹھیک ہے، یہ آدمی کام کا معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”اگر وہ پروف ریڈنگ کر رہا ہے تو اس کا مطلب ہے، پڑھا لکھا اور سمجھدار ہوگا۔ تم مجھے اس کے

میگزین کا نام اور فون نمبر بتا دو۔“

زاہد حسین نے مجھے بابر علی کے آفس کے فون نمبر کے علاوہ اپنے دفتر کے فون نمبرز بھی لکھوا دیئے۔ میں نے ریماٹڈ کے حوالے سے اسے چند ہدایات دیں اور تسلی دلا سے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔

آئندہ روز، میں نے اپنے دفتر سے یکے بعد دیگرے لبنی سلیم اور بابر علی کو فون کیا۔ بابر سے تو فون پر تفصیلی بات ہو گئی اور اس نے ایک آدھ روز میں میرے دفتر آ کر مجھ سے ملنے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن لبنی سلیم سے کھل کر بات نہیں ہو سکی۔ وہ اسی دفتر کے ریسپشن پر بیٹھتی تھی جس کے بارے میں مجھے معلومات درکار تھیں لہذا تفصیل سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ کسی وقت میرے دفتر آ کر ایک ملاقات کر لے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ دفتر سے چھٹی کے بعد میرے آفس آئے گی۔ اس کی رہائش سعید منزل پر تھی لہذا مجھے بچ کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔

عدالت نے زاہد حسین کو سات یوم کے ریماٹڈ پر پولیس کی تحویل میں دیا تھا۔ میں نے اس مدت کے دوران میں لبنی سلیم اور بابر علی سے تفصیلی ملاقات کر لی۔ لبنی سلیم واقعی زاہد حسین کی خیر خواہ تھی۔ اس نے دفتر کے حوالے سے کافی مفید معلومات دیں اور مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ میں اس کیس کے دوران میں کہیں بھی اس کا نام استعمال کروں گا اور نہ ہی کسی گواہی کے لیے اسے بلاؤں گا۔

”آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”آپ کا تعاون“ کسی کی نظر میں نہیں آئے گا۔ میں ان مفید معلومات کو بڑی احتیاط سے استعمال کروں گا۔ کسی بھی موقع پر یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ آپ نے مجھے کچھ بتایا ہے۔“

”تھینک یو بیگ صاحب!“ وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”کسی بھی آفس میں ٹیلی فون آپریٹر یا ریسپنشن کی پوسٹ کو زیادہ اہم یا اس آفس کا حصہ نہیں سمجھا جاتا لیکن میرے خیال میں سب سے زیادہ معلومات اسی پوسٹ کی حامل کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتی لیکن اسے سب پتا ہوتا ہے کہ کس ڈیپارٹمنٹ میں کہاں کہاں، کیا کیا ہو رہا ہے۔ بعض باتیں تو متعلقہ افراد خود ہی بتا دیتے ہیں، بالکل اس انداز میں جیسے وہ کسی جیتے

جاگتے انسان سے ہم کلام نہ ہوئی بلکہ کسی ٹھوس دیوار سے مخاطب ہوں.....!“
 ”اور اگر وہ دیوار آپ جیسی ہو تو خواخواہ دل کے اندر چھپی ہوئی باتیں بھی اگلنے کو جی چاہتا ہے.....!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔
 وہ جزبہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ میری تعریف کر رہے ہیں؟“

”بلاشبہ.....!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کو آئے روز اس بات کا تجربہ نہیں ہوتا رہتا؟“

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ”لوگوں کی نظریں اس تجربے سے بار بار گزرنے کا موقع فراہم کرتی رہتی ہیں۔“
 اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ لبنی سلیم ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی اور کشش میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ اپنے زمانے کی ایک سپر اسٹار انڈین ہیروئن سے گہری مشابہت بھی رکھتی تھی۔

میں نے لبنی سلیم کے تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ وہ ہر حوالے سے مطمئن ہو کر جائے۔ اس پر یا اس کی جاب پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اس نے ایک غریب بے گناہ کو بچانے کے لیے جو معلومات فراہم کی ہیں اس کا اجر اللہ خود اسے دے گا۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نیکی کے صلے میں، وہ قادر مطلق آپ پر شو بزنس کے دروازے کھول دے!“

”مجھے شو بزنس میں جانے کا شوق تو بہت ہے لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
 میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔ ”لیکن گھر والے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہی بات ہے نا؟“

اس نے میری توقع کے برخلاف جواب دیا۔ ”بیک صاحب! ایسی پابندی یا اجازت والی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے فلم لائن پسند نہیں۔ میں ٹی وی کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتی ہوں۔ کوئی ایسا سیریل، بلکہ کوئی ایسا سوپ کرنا چاہتی ہوں جس میں میرا کردار امر ہو کر رہے۔“

جائے.....!“

بولتے بولتے اس کا لہجہ خواب ناک ہو گیا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ شو بزم میں جانے اور شہرت حاصل کرنے کی کس قدر خواہش مند ہے۔

بہر حال میں نے نیک خواہشات کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے پتا چلا کہ لبتی کو اس کی تمنا کے عین مطابق ایک ٹی وی سوپ میں کام کرنے کا موقع بھی مل گیا ہے۔ مذکورہ سوپ میں اس نے اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ اس کی خواہش کے مطابق اس کا رول امر ہو کر رہ گیا۔

زاہد حسین کے دوست بابر علی سے بھی میری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ بابر علی کی رہائش ڈرگ روڈ کے علاقے میں تھی۔ وہ قابل بھر دسا شخص نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے ذمے چند کام لگائے جو اس نے بڑی محنت سے انجام دیے۔ یہ ساری تنگ و دو اور کوششیں میرے لیے تیروں کے مانند تھیں جن سے میں اپنے ترکش کو مالا مال کر رہا تھا۔ چند روز بعد میں جس اکھاڑے میں اترنے والا تھا وہاں تیر اندازی کے جوہر دکھانے والا ہی کامیاب ہوتا اور میں ہر صورت میں وکیل استغاثہ کو شکست دے کر اپنے موکل کو باعزت بری کرانے کا فیصلہ کر چکا تھا..... آگے اللہ کو جو بھی منظور ہوتا!



ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اس موقع پر اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی اور ضمانت کے حق میں دلائل دینے لگا۔

میرے دلائل کے جواب میں وکیل استغاثہ نے بھی زور مارا۔ اس کے ہر جملے کی تان اس نکتے پر آ کر ٹوٹتی تھی کہ ملزم کی ضمانت کی درخواست منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا اور اس سے کیس پر منفی اثرات مرتب ہونے کے بھی قوی امکانات ہیں۔

الغرض، پندرہ بیس منٹ کی بحث کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ ملزم کی درخواست ضمانت نام منظور کرتے ہوئے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔ میں خود بھی اسی نوعیت کے فیصلے کی توقع کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے قتل کیس کے ملزم کی ضمانت تقریباً ناممکن

ہوتی ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان کوشش ہی نہ کرے۔ اس روز بھی میں نے ملزم کی اہلیہ کو بھرپور تسلی کے بعد رخصت کر دیا۔ عدالت نے آئندہ پیشی کے لیے پندرہ دن بعد کی تاریخ دی تھی۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی بڑی بور اور خشک ہوتی ہے لہذا اس کی تفصیل میں جا کر میں آپ کی طبیعت کو کمدر نہیں کروں گا لہذا دو تین پیشیاں آگے بڑھ کر ہم اس مقام پر آتے ہیں جہاں سے استغاثہ کے گواہوں کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے میں آپ کو پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دیگر اہم امور سے آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کم سے کم الجھن کا شکار ہو اور آپ صحیح معنوں میں کہانی کا لطف اٹھا سکیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول خالد نظامی کی موت گیارہ اکتوبر کی رات چھ اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ کسی تیز دھار آلے کی مدد سے گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بعد ازاں، پولیس نے جائے وقوعہ سے آٹھ لقمے بھی حاصل کر لیا تھا۔ وہ لمبے پھل والی ایک تیز دھار چھری تھی جیسی ڈبل روٹی کاٹنے کے لیے بیکری والے استعمال کرتے ہیں۔ چھری کے لمبے پھل پر پائے جانے والے خون کے نمونے کے لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مقتول کو اسی چھری کے وار سے ہلاک کیا گیا تھا۔

استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں لگ بھگ نصف درجن افراد کے نام درج تھے لیکن میں یہاں پر صرف انہی کے بیانات اور جرح کا احوال پیش کروں گا جو کسی خاص حوالے سے اہمیت کے حامل ہوں۔ استغاثہ کی جانب سے بڑا مضبوط چالان پیش کیا گیا تھا اور بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ میرا موکل بچ نہیں پائے گا مگر میں بہ خوبی جانتا تھا کہ قوی مخالف کی اس سبسہ پلائی ہوئی دیوار میں کہاں کہاں نادیدہ شکاف موجود ہیں۔ مجھے انہی شکافوں میں گھس کر اپنے موکل کو باعزت بری کرانا تھا۔

اس کیس کی باقاعدہ عدالتی کارروائی شروع ہونے میں کم و بیش دو ماہ لگ گئے۔ بلا آخر کیس کی ایسی صورت نکل کر سامنے آئی کہ اس کا احوال بیان کیا جائے۔ اس پیشی پر جج اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا تو اس کی اجازت سے عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے میری ہدایت کے عین مطابق صحت جرم سے انکار

کر دیا۔ اس کی بعد ملازم کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔

میں تھانے کی حوالات میں جب زاہد حسین سے ملاقات کرنے گیا تھا تو اس کی کتھا سننے کے بعد میں نے اسے چند اہم امور ذہن نشین کرادیے تھے اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ملازم نے بیان دیتے وقت ان امور کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔

زاہد حسین کا حلفیہ بیان مکمل ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے ایکوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ کسی بھی کیس میں ملازم کے ساتھ وکیل استغاثہ کا رویہ بڑا سخت ہوتا ہے اور بعض مقامات پر تو یہ تحقیر آمیز ہو جاتا ہے لیکن ملازم کو جواباً جارحیت کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ وکیل مخالف کی ہر تند و ترش بات کو بڑے صبر اور تحمل سے سنتا ہے اور اپنی دانست میں جو بھی مناسب سمجھتا ہے جواب بھی دیتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کسی بھی کیس میں ملازم کی پوزیشن بڑی قابل رحم اور افسوس ناک ہوتی ہے۔

وکیل استغاثہ نے حسب روایت جرح کا آغاز کرتے ہوئے تیز آواز میں ملازم سے سوال کیا۔ ”تمہیں ”خان ٹریڈرز“ میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”عرصہ ہوا ہے نہیں جناب.....!“ ملازم نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”ہوا تھا کہیں..... کیونکہ پچھلے تین ماہ سے تو میں ایک دن بھی آفس نہیں گیا اور..... آگے کیا ہوگا، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔“

اگر دیکھا جائے تو ملازم نے کوئی غلط یا غیر اخلاقی بات نہیں کی تھی لیکن چونکہ وکیل استغاثہ ملازم کی طرف سے ایسی کسی بات یا انداز کی توقع نہیں رکھتا اس لیے اس جواب نے اسے خاصا مکدر کیا۔ وہ ملازم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جارحانہ لہجے میں بولا۔

”میرا یہی مطلب تھا.....!“

ملازم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”تقریباً چھ سال۔“

”تم اس کمپنی میں کس حیثیت سے کام کر رہے تھے؟“

”آفس بوائے!“ ملازم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”تمہیں اس کمپنی سے کتنی تنخواہ ملتی تھی۔“

”بارہ سو روپے۔“

”کیا تم اس تنخواہ پر خوش تھے؟“

”اس دنیا میں تو کوئی بھی شخص خوش نہیں ہے اور.....“

”فلسفہ نہیں!“ وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”اپنے جواب

کو صرف میرے سوال تک محدود رکھو۔“

ملزم نے بڑی رसान سے جواب دیا۔ ”میں اس تنخواہ پر مطمئن تھا۔“

”تمہیں گا ہے بہ گا ہے ایڈوانس کی بھی ضرورت پیش آتی رہتی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے

ٹیکھے انداز میں استفسار کیا۔ ”ہر چار پانچ ماہ کے بعد تم لون کے لیے اپنے پاس کے پاس کھڑے نظر

آتے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا؟“

میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ وکیل استغاثہ کس سوال کے لیے یہ گراؤنڈ بنانے کی کوشش کر رہا

تھا۔ اس موضوع پر ملزم سے میری تفصیلی بات ہو چکی تھی اور میں نے اسے خصوصی ہدایات بھی دی

تھیں۔ اس نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔

”پیسہ ہر انسان کی ضرورت ہے وکیل صاحب اور تنخواہ دار طبقے کو اس کی کچھ زیادہ ہی

ضرورت پیش آتی ہے۔ میں بھی ضرورت پڑنے پر اپنی کمپنی سے ایڈوانس لے لیا کرتا تھا۔ اکیلا میں

ہی کیا، دوسرے لوگ بھی کمپنی کی جانب سے فراہم کردہ اس سہولت سے گاہے بہ گاہے فائدہ اٹھاتے

رہتے تھے۔“

”لیکن تمہاری کمپنی کی یہ بھی تاریخ ہے کہ بعض اوقات قرض مانگنے والوں کو انکار بھی سننا

پڑتا تھا یا پھر ان کی مطلوبہ رقم سے بہ نسبت کم اماؤنٹ دیا جاتا تھا لیکن.....“ وکیل استغاثہ نے ڈرامائی

انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن تم اس کمپنی کے واحد خوش قسمت ملازم رہے ہو جس کی ضرورت کو کبھی انکار کا منہ

نہیں دیکھنا پڑا۔ تم نے گزشتہ چھ سال میں تقریباً دس مرتبہ کمپنی سے ایڈوانس لیا اور اس حصول میں

تمہیں کبھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر.....“

اس نے ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑ کر چبھتی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھا اور ایک

گہری سانس خارج کرنے کے بعد گویا ہوا۔ ”مگر گیارہویں دفعہ کمپنی نے تمہیں صاف منع کر دیا کیا

میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں.....“ ملزم نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وقوعہ سے لگ بھگ ایک ماہ پہلے ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔“

”اس واقعے کی تھوڑی تفصیل بتاؤ؟“ وکیل استغاثہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ملزم نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے آٹھ ستمبر کو قرض کے لیے درخواست دی تھی اور ایک دن چھوڑ کر یعنی دس ستمبر کو مجھے صاف منع کر دیا گیا کہ کمپنی کے حالات اچھے نہیں ہیں اس لیے فی الحال ایڈوانس نہیں مل سکتا۔“

”تم اس انکار پر بہت تلملائے تھے۔ تلملائے تھے نا؟“

”ظاہر ہے جی، یہ تو بات ہی تلملانے والی تھی۔“ ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے یوں چٹا انکار سننا پڑے گا۔“

”ہاں..... انسانی نفسیات کا یہ اہم اور حساس پہلو ہے۔“ وکیل استغاثہ نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”جہاں سے کبھی ”نہ“ سننے کو نہ ملی ہو وہاں سے اگر اس نوعیت کا جواب موصول ہو تو ذہن کو بڑا زبردست دھچکا لگتا ہے۔ تمہارے بھی ذہن کی عجیب حالت ہوئی ہوگی۔ تم بہت زیادہ جھنجھلائے اور شپٹائے ہو گے۔ تمہارے ذہن میں طرح طرح کے منفی خیالات آتے ہوں گے..... ہیں نا؟“

”جی ہاں، میرے ذہن کی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی!“ ملزم نے سادگی سے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے مکاری سے پوچھا۔ ”تم نے اس مرتبہ کتنے لون کے لیے درخواست دی تھی؟“

”دس ہزار روپے.....!“ ملزم نے جواب دیا۔

”دس ہزار!“ وکیل استغاثہ نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ ”اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ پہلے تو تم نے کبھی پانچ ہزار سے زیادہ قرض نہیں لیا تھا؟“

”پہلے میں ہمیشہ اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کمپنی سے قرض لیا کرتا تھا اور آسان قسطوں میں، اپنی تنخواہ میں سے کٹوا دیا کرتا تھا لیکن اس بار.....“ وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا اور الجھن زدہ نظر سے، حاضرین عدالت میں موجود اپنی بیوی ثانیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے رد عمل سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھی آگے بولنے والا تھا اس کا تعلق کسی نہ

کسی حوالے سے ثانیہ کی ذات سے تھا۔ ملزم کی ہچکچاہٹ نے وکیل مخالف کی ہمت کو ہمیز کیا اور اس نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

”لیکن اس بار..... کیا ہوا تھا.....؟“

ملزم نے ندامت آمیز انداز میں اپنی بیوی ثانیہ کی طرف دیکھا پھر وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب تو میری بیوی اس معاملے سے پوری طرح آگاہ ہو چکی ہے لیکن اس وقت یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ میں دفتر سے دس ہزار روپے قرض لینے والا ہوں۔ بہر حال.....“ وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”در اصل، میں ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے میرے ایک دوست کو اچانک دس ہزار روپے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس نے ایمر جنسی میں مجھ سے مانگے اور کہا کہ ایک ماہ کے بعد واپس کر دے گا۔ میں نے پچھلی مرتبہ آفس سے جوں اٹھایا تھا، اس کی ابھی دو قسطیں باقی تھیں۔ میں اپنا کھانا صاف کیے بنا مزید قرض نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اپنے دوست کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک سود خور شخص سے دس ہزار روپے قرض لے لیے، سوچا تھا ایک ماہ کے بعد دوست رقم واپس کر دے گا تو جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے اپنے اس دوست پر یہ واضح کر دیا تھا کہ میں ضامن بن کر کسی سود خور سے رقم لے رہا ہوں۔ وہ مجھے جانتا ہے اس لیے رقم مجھے ہی دے گا اور ایک ماہ بعد مجھ سے ہی واپس بھی لے گا۔ جیسا کہ سود کے کاروبار کا دستور ہوتا ہے، اس بندے نے اپنے سود کی رقم ایک ہزار روپے کاٹ کر نو ہزار کے نوٹ میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا تھا کہ ایک ماہ کے بعد مجھے پورے دس ہزار اسے لوٹانا ہوں گے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے پوچھا، اگر کسی وجہ سے دیرو سویر ہو جائے تو؟ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔

”اگر تم ٹھیک تیس دن کے بعد رقم لوٹاؤ گے تو تمہیں دس ہزار ہی دینا ہوں گے لیکن اگر ایک دن بھی اوپر ہو گیا تو ایک ہزار سود لاگو ہو جائے گا۔ ویسے اگر تم ہر ماہ پابندی سے مجھے سود کے ایک ہزار دیتے رہو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی.....!“

میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”اور اصل قرض یعنی دس ہزار روپے کا کیا ہو

”وہ اپنی جگہ اسی طرح موجود رہیں گے جیسے اس وقت ہیں۔“ مذکورہ شخص نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے، یہ تو خاصہ پیچیدہ اور خطرناک کھیل ہے!“ میں نے گہرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تم..... اسے جو بھی سمجھو لیکن یہ میرا بزنس ہے۔“ وہ اٹل انداز میں بولا۔

میں نے نو ہزار کی وہ رقم اپنے دوست کے حوالے کرتے ہوئے اسے اس معاملے کی تمام نزاکتوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اٹھائیس دن بعد ہی یہ رقم مجھے لوٹا دے گا۔“

”اور تمہارے اس دوست کے وہ اٹھائیس دن ابھی تک پورے نہیں ہوئے!“ ملزم جیسے ہی خاموش ہوا، وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ تمہیں چونا لگا کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

ملزم نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

یہ واقعہ آج سے لگ بھگ پینتیس سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں ایک تنخواہ دار شخص کے لیے دس ہزار روپے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ جو ریکروٹنگ ایجنٹ لوگوں کو سعودیہ یا دیگر عرب ممالک بھجواتے تھے وہ کم دیش بیس ہزار روپے ہی لیا کرتے تھے۔ میرے موکل کا مذکورہ دوست اس سے فراڈ کر کے بیرون ملک چلا گیا تھا اور وہ اس کے کیے کو بے چارگی سے بھگت رہا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اس سلسلے میں خاصی محنت کر کے معلومات جمع کی تھیں لیکن بہر حال، ان قصے کہانیوں سے اس کا کچھ بھلا ہونے والا نہیں تھا!

وکیل استغاثہ نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا دوست تو بڑی صفائی سے نکل گیا اور تم دو ماہ تک اس کی جگہ سود بھرتے رہے۔ اس کے لیے تم نے اپنی تھوڑی بہت جو جمع پونجی تھی وہ بھی خرچ کر دی پھر جب تمہارے پچھلے قرض کی قسطیں پوری ہو گئیں تو تم نے دس ہزار روپے کے لیے کمپنی میں درخواست دے دی تاکہ سود خود شخص سے یک مشت ادائیگی کر کے جان چھوٹ جائے لیکن.....“ وکیل استغاثہ نے رک کر ڈرامائی انداز میں حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”لیکن کمپنی نے تمہیں قرض دینے سے صاف انکار کر دیا.....!“

”جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔“ ملزم نے تائیدی انداز میں کہا۔

”اور اس صورت حال نے تمہارے دماغ کا فیوز اڑا دیا۔“ وکیل استغاثہ موجودہ پچویشن

پر نمک پاشی کرتے ہوئے بولا۔ ”تم سودا پس لعت کے ایک ایسے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے کہ

تمہارا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ کمپنی کے مالک سعد اللہ خان نے آج سے پہلے تمہیں کبھی منع نہیں کیا تھا۔

تمہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے خاص طور پر تمہارے خلاف باس کے کان بھرے ہیں۔ تم نے

چند روز تک تحقیق اور تفتیش کی پھر تم مطلوبہ شخص کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور..... وہ شخص

تھا، مقتول خالد نظامی!“

”جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ملزم نے اثبات میں گردن ہلاتے

ہوئے جواب دیا۔ ”جی ایم صاحب ہی نے میرا ایڈوائس رکوا دیا تھا۔“

”اس واقعے کے بعد مقتول (جی ایم) کے لیے تمہارا دل و دماغ غم و غصے سے بھر گیا

تھا۔“ وکیل استغاثہ نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا تاہم اس کے لہجے میں پہلے کی بہ نسبت خاصی

تیزی آگئی تھی۔ ”تم ادھر ادھر بیٹھ کر مقتول کے خلاف باتیں بھی کرنے لگے تھے..... ہاں یا نہ؟“

”ہاں!“ ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”میں جس نوعیت کی صورت حال میں

پھنسا ہوا تھا، میری جگہ کوئی اور شخص بھی ہوتا تو وہ ایسا ہی سوچتا.....“

”وقعہ سے دو یا تین روز پہلے تم اپنی کمپنی کے اکاؤنٹ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔“

وکیل استغاثہ تیزی سے حصول مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اور تمہارے درمیان موضوع

گفتگو بھی یہی تھا۔ عارف محمود کو تم سے گہری ہمدردی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تمہاری ضرورت پوری ہو

لیکن ظاہر ہے، وہ باس کی اجازت کے بغیر تمہیں کمپنی کے کیش میں سے ایک پیسا بھی نہیں دے

سکتے تھے اور باس اس سلسلے میں صاف انکار کر چکا تھا۔ اس روز اپنی پریشانی اور بے بسی کے ہاتھوں

مجبور ہو کر تم نے مقتول کے حوالے سے خاصے خطرناک الفاظ استعمال کیے تھے۔ یہ تمہارے جذبات

کی فطری ترجمانی تھی۔ یاد ہے، اس روز تم نے عارف محمود سے کیا کہا تھا.....؟“

وکیل استغاثہ نے سوالیہ انداز میں ملزم کی طرف دیکھا تو وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔

وکیل استغاثہ نے جلدی سے کہا۔

”تم نے جلع ہوئے دل کے ساتھ بڑے زہریلے الفاظ میں کہا تھا..... اگر تمہارا بس چلے تو تم چائے میں زہر ملا کر مقتول کو پلا دو..... کہا تھا؟“

”جی..... میں نے ایسا کہا تھا۔“ ملزم نے گہری سنجیدگی سے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔
”میں اس وقت بہت غصے میں تھا اور جذبات میں آدمی کچھ بھی بول جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں واقعی مقتول کو زہر پلے چائے پلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔“

”بالکل درست!“ وکیل استغاثہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”واقعی، تم ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے حالانکہ یہ کام سراسر تمہارے بس میں تھا اور تمہیں اس فعل سے کوئی روکنے والا نہیں تھا.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ اس روز تم نے عارف محمود کے سامنے بیٹھ کر جن خیالات کا اظہار کیا، وہ ایک مخصوص جذباتی ابال کے زیر اثر تھا۔ بعد میں تم نے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ زہر آلود چائے والا آئیڈیا زیادہ تسکین آفرین نہیں ہے۔ تم ان لمحات میں مقتول سے جتنی نفرت کرتے تھے اس کے پیش نظر کوئی ایسی ترکیب آزمانا چاہتے تھے جس سے مقتول کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچے جیسی.....“ وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جیسی تم نے زہر آلود چائے والے آئیڈیا کو رد کر کے ڈبل روٹی والی چھری کو آزمایا اور اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیا.....!“

”آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔“ ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جی ایم صاحب کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ ایک سوچی سمجھی اور گہری سازش کے تحت مجھے اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”تمہارے خلاف ایسی سازش کون کر رہا ہے!“ وکیل استغاثہ اکھڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تم کسے اپنا دشمن سمجھتے ہو؟“

میرے موکل نے وکیل مخالف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ ”میں اس وقت استغاثہ کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہوں.....!“

وکیل استغاثہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ملزم کے جواب نے اسے تملکا کر

رکھ دیا۔ تاہم اپنی تملہاٹ کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے معتدل لہجے میں پوچھا۔
 ”کیا تم اس حقیقت سے انکار کرو گے کہ وقوعہ کے روز مقتول سے ملنے، اس کا ایک دوست آفس آیا تھا؟“

”یہ چونکہ ایک اہل حقیقت ہے اس لیے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“ ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”مقتول کے اس دوست کا نام تو صیف احمد ہے۔“

”مقتول نے تم سے کہا کہ اس کے دوست کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔“ وکیل استغاثہ نے چپھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”اور تم چائے لینے دفتر سے باہر چلے گئے پھر ریکارڈ کے مطابق، تمہاری واپسی نہیں ہوئی لیکن آف دی ریکارڈ..... تم ہوٹل سے چائے لے کر لوٹے تھے اور پھر جب تم آفس پہنچے تو مقتول کا دوست جاچکا تھا۔ تم نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کا فوری فیصلہ کر لیا.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”اس وقت تک آفس کے تمام لوگ جا چکے تھے۔ صرف مقتول تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ یقیناً اس تاخیر کے لیے اس نے تمہیں گرم گرم سنائی ہوں گی۔ تم پہلے ہی اس کی طرف سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ تم سے برداشت نہ ہوا اور تم نے مقتول کا کام تمام کر دیا.....!“

”یہ سراسر الزام ہے۔“ ملزم نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”اس میں ذرا سی بھی صداقت نہیں۔ میں نے جی ایم صاحب کو قتل نہیں کیا۔ قتل کی اس واردات سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں۔“ یہ ٹھیک ہے کہ جی ایم صاحب کی طرف سے میرا دل بہت دکھا ہوا تھا لیکن یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ میں ان کے خون میں ہاتھ رنگ بیٹھتا۔ میں بے گناہ و بے قصور ہوں.....“

وکیل استغاثہ نے مزید دو تین سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! ملزم سے سوال و جواب کرنے سے پہلے میں چند باتیں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے کرنا چاہتا ہوں، اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو!“

”یو آ پر میڈ“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتا ہے۔ جج

کے اشارے پر سب انسپکٹر قادر بخش وینس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور صحت مند شخص تھا جس کی کنٹیوں پر سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے آئی، او کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سب انسپکٹر قادر بخش صاحب! آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں، بہ الفاظ دیگر آپ استغاثہ کے وارث اور ذمے دار ہیں۔ وکیل استغاثہ چونکہ آپ کے پیش کردہ چالان کی وکالت کر رہے ہیں لہذا ان کے قول و فعل کی ذمے داری بھی آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ بجا فرما رہے ہیں۔“ انکواری آفیسر نے رعوت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”پوچھیں..... آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

میں نے پوچھنا شروع کیا۔ ”آئی او صاحب! تھوڑی دیر پہلے، ملزم پر جرح کرتے ہوئے آپ کے وکیل نے یہ ”انکشاف“ کیا ہے کہ.....“ میں نے لفظ ”انکشاف“ پر خصوصی دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آف دی ریکارڈ، جب ملزم ہوٹل سے چائے لے کر واپس آیا تو مقتول کا مہمان دوست جا چکا تھا اور اس وقت آفس میں مقتول اور ملزم کے سوا اور کوئی شخص موجود نہیں تھا چنانچہ بقول وکیل استغاثہ ملزم کو اپنے مذموم عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ ان باتوں کو کس طرح ثابت کریں گے؟“

”کن باتوں کو؟“ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”مثلاً ان باتوں کو کہ میرا موکل وقوعہ کے روز واقعی چائے لے کر واپس آیا تھا؟ جب وہ واپس آیا تو مقتول کا مہمان رخصت ہو چکا تھا؟ ان لمحات میں مقتول اور ملزم کے سوا آفس میں اور کوئی شخص موجود نہیں تھا؟..... اور یہ کہ مقتول نے ملزم کے تاخیر سے پہنچنے پر اسے کھری کھری سناپی تھیں جس کے نتیجے میں طیش میں آ کر ملزم نے ڈبل روٹی والی چھری کا ایک خوفناک وار کر کے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟ آپ کو ان تمام سوالات کے جوابات میں ٹھوس ثبوت مہیا کرنا ہوں گے کیونکہ عدالت ثبوت کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کرتی اور.....“ میں تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اور میرا موکل ان تمام واقعات سے انکاری ہے۔ اس کے بیان کی تصدیق یا تردید

کرنے کے لیے مقتول کو گواہوں والے کٹہرے میں کھڑا کرنا ممکن نہیں۔ ملزم کے مطابق، وقوعہ کے روز وہ آفس سے نکلا تو پھر واپس نہیں آیا بلکہ سیدھا اپنے گھر چلا گیا تھا پھر اگلے روز پولیس نے اسے اس کے گھر واقع منظور کالونی سے گرفتار کیا تھا۔ میرا خیال ہے، آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے؟“

”اچھی طرح سمجھ گیا ہوں جناب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور آپ کے سوالات بلکہ اعتراضات کے بھی تسلی بخش جواب ہیں میرے پاس.....!“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جس وقت مقتول کا مہمان دوست توصیف احمد اس سے ملاقات کے لیے دفتر پہنچا تو مقتول اور ملزم کے علاوہ کمپنی کا اکاؤنٹنٹ عارف محمود بھی آفس میں موجود تھا۔ وہ اس بات کی گواہی دے سکتا ہے کہ مقتول نے ملزم کو چائے لینے کے لیے بھیجا تھا۔ علاوہ ازیں اس امر کی وضاحت کے لیے توصیف احمد سے بھی پوچھا جاسکتا ہے۔ توصیف کی دفتر میں آمد و شد کے اوقات اور مقتول کی موت کے متوقع وقت کے تناظر میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مقتول کو توصیف کے جانے کے بعد قتل کیا گیا تھا اور اس وقت ظاہر ہے، دفتر میں صرف دو افراد ہی موجود تھے۔ نمبر ایک مقتول، نمبر دو ملزم..... مقتول اس دنیا سے چلا گیا اور ملزم اس کے قتل کے الزام میں اس وقت کٹہرے میں کھڑا ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی کہانی ہے جسے بڑی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے اور جہاں تک ملزم کے چائے لے کر واپس آنے کا تعلق ہے تو.....“

”آپ نے صرف دو افراد کا ذکر کر کے جان چھڑالی ہے جبکہ.....“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے بتایا تھا کہ جب مقتول نے ملزم کو اپنے دوست کے لیے چائے لینے کو بھیجا تو ”خان ٹریڈرز“ کا اکاؤنٹنٹ عارف محمود آفس میں موجود تھا..... گویا دو نہیں، تین افراد دفتر میں موجود تھے.....!“

یہ استفسار میں نے محض انکوائری آفیسر کے ذہن کو الجھانے کے لیے کیا تھا ورنہ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ آن ریکارڈ اکاؤنٹنٹ عارف محمود ٹھیک چھ بجے دفتر سے اٹھ گیا تھا اور اس وقت مقتول، ملزم اور توصیف آفس میں موجود تھے۔، تفتیشی افسر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”میں نے پہلے کچھ غلط کہا تھا اور نہ ہی اب دروغ گوئی سے کام لے رہا ہوں۔“

اکاؤنٹ عارف محمود اس بات کا گواہ ہے کہ جب تو صیف مقتول سے ملنے آیا تو ان کے علاوہ دفتر کا دیگر عملہ رخصت ہو چکا تھا، پھر ٹھیک چھ بجے عارف محمود بھی اپنے گھر چلا گیا۔ اب بچے مقتول، ملزم اور مقتول کا مہمان تو صیف احمد.....!“ وہ لمحے بھر کے لیے تھا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”مقتول نے ملزم کو چائے لینے کے لیے بھیجا لیکن اس کی واپسی میں دیر ہو گئی۔ تو صیف کے بیان کے مطابق، وہ زیادہ دیر تک وہاں رک نہیں سکتا تھا لہذا چائے آنے سے پہلے ہی وہ رخصت ہو گیا اور جہاں تک سوال ہے اس بات کا کہ ملزم چائے لے کر واپس آیا تھا یا نہیں اس کا ثبوت ہمیں کچن سے مل گیا ہے۔ وہاں ہوٹل والی وہ مخصوص چینک موجود تھی جو ملزم لے کر آیا تھا اور..... آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ چینک چائے سے بھری ہوئی تھی!“

انکو اڑی آفسر نے آخری جملہ بڑے انکشاف انگیز انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور کاٹ دار آواز میں کہا۔

”تو ان حالات سے آپ نے اندازہ قائم کیا کہ جب ملزم تاخیر سے چائے لے کر واپس آیا تو مقتول نے اسے ڈانٹ پلائی ہوگی۔ جواب میں ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا، آلہ قتل کو مقتول کے کمرے کے فرش پر پھینکا، روشنیوں کو جلتا ہوا چھوڑا اور دفتر سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے اس بات کی ضرورت بھی محسوس نہ کی کہ داخلی دروازے کی تاب کو دبا کر وہ آفس کو لاک کر دیتا۔ وہ قتل کی یہ واردات کرنے کے بعد اطمینان سے اپنے گھر چلا گیا۔ میں آپ کے خیالات کو بیان کرنے میں کسی کوتاہی سے کام تو نہیں لے رہا؟“

”نہیں جناب..... بالکل ایسا ہی پیش آیا ہوگا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”بہت بہت شکریہ آئی اوصاحب!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”آپ نے میرے پوچھے ہوئے تمام سوالات کے جوابات فراہم کر دیے۔ جن معاملات کا تعلق عارف محمود اور تو صیف احمد سے ہے، اس کی تصدیق میں انہی سے کروں گا۔ میں نے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست دیکھی ہے۔ ان دونوں کے نام مذکورہ فہرست میں شامل ہیں۔“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد مزید کہا۔

”میں آپ سے چند ایک سوالات جائے وقوعہ کے حوالے سے بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے بڑے تجربہ کار اور سمجھ دار تفتیشی افسر نظر آ رہے ہیں۔ آپ کو میرے سوالات پر کوئی

اعتراض تو نہیں؟“

”بالکل اعتراض نہیں جناب۔“ وہ وکیل مخالف کے منہ سے اپنی تعریف سن کر ایک دم پھول گیا اور بڑے دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”پوچھیں، کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“

میں نے پوچھا۔ ”آلہ قتل، جائے وقوعہ سے دستیاب ہو گیا تھا۔ اس کے لمبے سے پھل پر مقتول کا خون بھی لگا ہوا تھا۔ کیا آپ نے اس مخصوص چھری کے دستے پر سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی؟“

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”یہ کام تو ہم پہلی فرصت میں کرتے ہیں۔“

”کیا آلہ قتل کے دستے پر آپ کو ملزم کی انگلیوں کے نشانات مل گئے تھے؟“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں جناب.....“ اس نے مایوسی سے سرکونٹی میں حرکت دی اور بولا۔ ”آلہ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس موجود نہیں تھے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ قتل کی واردات کے بعد اس نے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر کے آلہ قتل کو جائے وقوعہ پر پھینک دیا تھا۔“

”اس کا واضح اور غیر واضح جو بھی مطلب ہے، وہ انشاء اللہ بہت جلد سامنے آ جائے گا۔“

میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”فی الحال تو آپ میرے ایک نہایت ہی اہم سوال کا جواب دیں لیکن یہ جواب آپ کو بہت سوچ سمجھ اور ناپ تول کر دینا ہو گا کیونکہ میں آپ کے جواب کے الفاظ ہی سے اس کیس کا تختہ کروں گا.....!“

میرے دھمکی بھرے انداز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے تشویش ناک انداز میں آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا اور الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کا مطلب کیا ہے جناب؟“

میں اسے اپنا مطلب سمجھانے لگا۔ ”آئی او قادر بخش صاحب! جب آپ قتل کی کسی سنگین واردات کی اطلاع ملنے پر جائے وقوعہ پر پہنچتے ہیں تو آپ کے پیش نظر دو اہم امور ہوتے ہیں۔ نمبر ایک، مقتول کی لاش کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ۔ نمبر دو، جائے واردات کا مکمل نقشہ تیار کرنا۔ تیسرا اہم امر آلہ قتل کی تلاش ہوتا ہے۔ میں چونکہ آلہ قتل سے متعلق بات کر چکا ہوں لہذا یہ بتائیں کہ آپ نے دیگر دونوں کام تسلی بخش انداز میں کیے تھے نا؟“

”جی جی..... بالکل.....!“ وہ ہر دھوکہ انداز میں بولا۔

”میں نے چالان کی شکل میں، آپ کی مرتب کردہ رپورٹ کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ اس میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت تو نہیں؟“

”قطعاً نہیں۔“ وہ دھوکہ انداز میں بولا۔ ”میری رپورٹ کا ایک ایک لفظ فل اینڈ فائنل ہے۔“

”میں پوری رپورٹ کی بحث میں تو نہیں پڑوں گا۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”میرا فوکس صرف مقتول کی لاش اور جائے وقوعہ تک محدود ہے۔ آپ کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق، مقتول کو تیز دھار والی لمبے پھل کی چھری سے قتل کیا گیا تھا۔ مذکورہ آلہ قتل کے ایک مہلک وارنے مقتول کی گردن کو دائیں جانب سے، کان سے انچ، ڈیڑھ انچ نیچے کاٹ ڈالا تھا اور اسی جان لیوا وار نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ شواہد کے مطابق، جب اس کی گردن پروار کیا گیا، وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ گردن کٹنے کے بعد اس کا سر میز پر آ رہا اور اس طرح آ رہا کہ گردن کا کٹنا ہوا حصہ اوپر اور سلامت حصہ نیچے یعنی میز کی سطح سے پھوٹا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

میں نے رک کر سوالیہ نظر سے انکو آری آفیسر کو دیکھا تو وہ تصدیقی لہجے میں بولا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ نے میرے مشاہدے اور تجزیے کے عین مطابق بات کی ہے۔“

”اب میں جائے وقوعہ کی طرف آتا ہوں۔“ میں نے سلسلہ استفسارات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مقتول کا کمر ابارہ ضرب دس فٹ پینائش کا حامل تھا جس میں آمدورفت کے لیے دو دروازے تھے۔ دروازہ نمبر ایک مشرقی دیوار کے آخری سرے پر واقع تھا جس کے اختتام سے جنوبی دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ دراصل یہی کمرے کا اصل دروازہ تھا۔ میں نے جس دوسرے دروازے کا ذکر کیا ہے وہ درحقیقت شمالی دیوار کے آخری سرے پر واقع واش روم کا دروازہ تھا جس کے کونے سے مغربی دیوار کا آغاز ہوتا تھا۔ مقتول نے اپنی کرسی میز اس انداز میں سیٹ کر رکھی تھی کہ وہ شمالی اور مشرقی دیواروں کے ملاپ سے وجود پانے والے کونے کو گھیرے بیٹھا تھا وہ اس طرح کہ کمرے کی شمالی دیوار اس کی کرسی کی پشت پر تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ، مشرقی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سائڈ ٹیبل تھی۔ اس سائڈ ٹیبل کے اختتام پر جوڑ کر بڑی میز لگائی گئی تھی جو مقتول کی کرسی کے سامنے پڑتی تھی جیسا کہ عام طور پر آفس فرنیچر کو سیٹ کیا جاتا ہے۔ مقتول اپنی کرسی کی طرف آنے

جانے کے لیے دائیں جانب کا حصہ استعمال کرتا تھا یعنی کمرے کا وہ کونا جو شمالی اور مغربی دیوار کے اتصال سے وجود میں آیا تھا۔ اس کونے کے شمالی حصے میں واش روم کا دروازہ تھا اور مغربی حصے میں انرکنڈیشنر نصب تھا اور صرف اتنی جگہ باقی بچتی تھی کہ بہ آسانی چل پھر کر کرسی کی طرف جایا جائے یا پھر واش روم کی راہ پکڑی جائے۔“ میں نے چند لمحات کے لیے توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مقتول کی میز کی پینش تین بائی پانچ فٹ تھی جس کے آگے ملاقاتیوں کے لیے تین آرام دہ کرسیاں رکھی رہتی تھیں۔ مذکورہ میز پر فلاں فلاں چیزیں رکھی تھیں۔ کمرے کی جنوبی دیوار پر فائلوں اور مختلف دستاویزات کے لیے دیوار گیر کینٹنس وغیرہ بنی ہوئی تھیں۔ کمرے کے فرش پر نیوی بلیو کٹر کا سٹنٹھیک کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے آف دہانٹ تھے۔ اگر اس تفصیل میں کہیں شہ بھر بھی غلطی یا رد و بدل نظر آئے تو آپ مجھے نوک سکتے ہیں.....!“

میں نے جائے وقوعہ کا ایسا تفصیلی نقشہ کھینچا تھا کہ انکوائری آفیسر کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ وہ شدت حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز میں طنز نہیں تھا۔

”وکیل صاحب! آپ کو تو ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے۔ آپ وکالت میں کہاں وقت برباد کر رہے ہیں.....!“

”اب ایسی بری بری فائلیں تو نہ نکالیں منہ سی آئی او صاحب!“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”آپ کا ڈیپارٹمنٹ آپ ہی کو مبارک ہو، مجھے میرے پیٹھے میں رہنے دیں اور مہربانی فرما کر یہ بتا دیں کہ میں نے جو تفصیل جائے وقوعہ کے حوالے سے بیان کی ہے، اس میں کوئی کمی یا خرابی تو نہیں ہے؟“

میں نے اتنی زیادہ تفصیل صرف ایک مقصد حاصل کرنے کے لیے بیان کی تھی اور اس خاص مقصد کا تعلق مقتول کی نشست سے تھا یعنی مقتول کی کرسی اور میز کمرے کے کس مقام پر، کس زاویے سے رکھی ہوئی تھیں اور اس کی لاش کس کیفیت میں پائی گئی تھی۔ باقی ساری تفصیل انکوائری آفیسر کو الجھانے اور حیران کرنے کے لیے تھی اور میں اپنی اس کوشش میں صد فیصد کامیاب رہا تھا۔

انکوائری آفیسر نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ”آپ نے جائے واردات کی منظر نگاری میں کہیں کوئی غلطی نہیں کی لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....!“

”کون سی بات آئی اوصاحب؟“ اسے الجھن میں گرفتار دیکھ کر میں نے پوچھ لیا۔

”یہ کہ..... آپ نے یہ ساری تفصیل کیوں بیان کی ہے؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!“ میں نے معصومیت سے جواب دیا۔

”لیکن مجھے معلوم ہے.....“ یہ آواز وکیل استغاثہ کی تھی۔

میں پچھلے بیس پچیس منٹ سے تفتیشی افسر کے ساتھ مصروف تھا اور وکیل استغاثہ کو کہیں سے کوئی لفٹ نہیں مل رہی تھی۔ اسے کافی انسلٹ محسوس ہوئی جیسی اپنی موجودگی کے اظہار کے لیے اس نے آواز بلند کی تھی۔

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی!“ معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنا بیگ صاحب کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور لگ بھگ آدھے گھنٹے کی عدالتی کارروائی سے یہ بات ثابت بھی ہو گئی ہے۔ میرے فاضل دوست کرید کرید کر آئی اوصاحب سے سوالات کرتے رہے اور آخر میں کہہ دیا کہ انہیں کچھ پتا نہیں، یہ سب انہوں نے کیوں پوچھا..... صاف ظاہر ہے، عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے لیے.....!“

جج نے عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا اور تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟“

”میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہوں گا کہ میں نے معزز عدالت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری یہ ساری محنت ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے تھی اور اللہ کا شکر ہے، میں نے وہ مقصد حاصل کر لیا ہے۔“

”کون سا مقصد؟“ وکیل استغاثہ نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”میرے فاضل دوست! میں نے کڑی محنت کے بعد یہ مقصد حاصل کیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو پکی پکائی مل جائے یہ نہیں ہو سکتا مائی ڈیئر..... آپ بھی ذرا ہاتھ پاؤں اور زبان ہلائیں۔“ پھر میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں نے جس خاص مقصد کا ذکر کیا ہے وہ میں ایک دو پیشی کے بعد معزز

عدالت کے سامنے بیان کروں گا، پہلے استغاثہ کے گواہان مسٹر عارف محمود اور مسٹر توصیف احمد کا بیان ہو جائے۔“

”کیا آپ کے متذکرہ مقصد کا تعلق انہی دو افراد سے ہے؟“ جج نے دلچسپی لیتے ہوئے

مجھ سے پوچھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جناب عالی! تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے میں نے انکوائری آفیسر پر جو بحث کی ہے وہ سراسر قاتل تک رسائی کے لیے ہے۔ استغاثہ کے مطابق، میرے موکل نے اپنے جنرل نیجر خالد نظامی کو قتل کیا ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اگر میں استغاثہ کا ہم خیال ہوتا تو آج ملزم کی وکالت نہ کر رہا ہوتا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ میرے موکل کو کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھنسا گیا ہے۔ خالد نظامی کا قاتل کوئی اور شخص ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق.....“ میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول خالد نظامی کی موت گیارہ اکتوبر کی شام چھ اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ چھ بجے سے پہلے آفس کے بیشتر لوگ چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ واقعات کے مطابق، کمپنی کا اکاؤنٹنٹ عارف محمود ٹھیک چھ بجے دفتر سے نکلا تھا اور اس وقت مقتول، ملزم اور مقتول کا دوست ملاقاتی توصیف احمد دفتر میں موجود تھے۔ اگر استغاثہ کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے موکل نے خالد نظامی کو قتل کیا ہے تو جواباً بیفیس بھی یہ دعویٰ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے کہ قاتل عارف محمود یا توصیف احمد میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے یا ان کے علاوہ باہر کا کوئی شخص بھی بہر حال.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”قاتل جو کوئی بھی ہے، میں اسے بہت جلد بے نقاب کر دوں گا۔ میں نے یہ ساری محنت خواہ مخواہ ہی نہیں کی.....“

”اٹس او کے.....!“ جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر مجھ سے

پوچھا۔ ”آپ ملزم سے کوئی سوال کرنا چاہیں گے؟“

میں نے انکوائری آفیسر کا ”انٹرویو“ کرنے سے پہلے یہ کہا تھا کہ ملزم سے میں بعد میں بات کروں گا۔ اسی حوالے سے جج نے مجھ سے استفسار کیا تھا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں دس پندرہ منٹ ہی باقی تھے اور جج نے مجھ سے پوچھنے سے پہلے دیوار گیر کلاک پر بھی نگاہ ڈالی تھی۔

میں نے کھڑک کر گلا صاف کیا اور کہا۔ ”جناب عالی! میں ملزم سے صرف دو تین سوالات پوچھوں گا تاکہ آئندہ سماعت کے لیے گراؤنڈ تیار کیا جاسکے۔“
جج نے مجھے اجازت دے دی۔

میں نے ملزم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یاد ہے، وقوعہ کے روز مقتول کا ملاقاتی دوست تو صیف احمد اس سے ملنے کے لیے کتنے بجے دفتر پہنچا تھا؟“
”جی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ ملزم نے جواب دیا۔ ”تو صیف صاحب لگ بھگ ساڑھے پانچ پونے چھ بجے آئے تھے۔“

”ساڑھے پانچ یا پونے چھ؟“ میں نے پوچھا۔ ”ایک جواب چاہیے.....!“
”پونے چھ زیادہ صحیح رہے گا۔“ ملزم نے حتمی لہجے میں کہا۔
”جب تو صیف مقتول سے ملے آیا، تمہارے اور مقتول کے علاوہ اور کون کون دفتر میں موجود تھا؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”صرف اکاؤنٹس صاحب۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔ ”باقی تمام لوگ جا چکے تھے۔“

”اکاؤنٹس صاحب.....“ میں نے تصدیقی انداز میں ملزم کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے، عارف محمود صاحب؟“

”جی..... جی ہاں!“ ملزم نے جواب دیا۔

”پھر کیا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

ملزم نے بتایا۔ ”جب بھی دفتر میں کسی کا مہمان آتا ہے تو میں سب سے پہلے اسے پانی کا ایک گلاس پیش کرتا ہوں اور سوالیہ نظر سے میزبان کی طرف دیکھتا ہوں کہ اگر اسے پانی سے آگے بڑھ کر اپنے ملاقاتی کی خاطر تواضع کرنا ہو تو وہ بتائے۔“

”پھر.....“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”مقتول کی طرف سے تمہیں کوئی اشارہ یا حکم ملا

تھا؟“

”جی ہاں۔“ ملزم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”خالد صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ

میں تو صیف صاحب کو اچھی سی چائے پلاؤں۔“

”اور تم چائے لینے کے لیے دفتر سے باہر..... بلکہ بلڈنگ سے باہر چلے گئے تھے۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ”ہیں نا.....؟“

”جی ہاں۔ ہماری بلڈنگ کی بغلی گلی میں ایک چائے کا ہوٹل ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں وہیں سے چائے لینے گیا تھا۔“

”تم ہوٹل سے چائے لینے کیوں گئے تھے؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”جبکہ خان ٹریڈرز کے آفس میں ایک باقاعدہ کچن موجود ہے جہاں تم سب کے لیے خود چائے بناتے تھے اور دیگر لوگوں کا کھانا وغیرہ بھی گرم کرتے تھے۔ جب دفتر کے کچن میں چائے کا باقاعدہ آرینجمنٹ موجود تھا تو پھر تم باہر سے چائے لینے کیوں گئے تھے؟“

”دیکھ صاحب! آپ نے چائے اور کچن کے حوالے سے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔“ ملزم نے تائیدی انداز میں بتایا۔ ”لیکن کبھی کبھار ایسا موقع بھی آتا تھا کہ چائے کے سامان میں سے کوئی شے ختم ہو جائے مثلاً دودھ، پتی یا چینی..... تو دوقوعہ کے روز بھی اتفاق سے، سہ پہر کی چائے بنانے کے بعد دودھ بالکل ختم ہو گیا تھا اور میں نے اس سلسلے میں کوئی فکر بھی نہیں کی کہ سہ پہر والی چائے ہمارے آفس کی باقاعدہ آخری چائے ہوتی تھی۔ اس کے بعد تو ضرورت پڑنے پر باہر سے بھی لائی جاسکتی تھی۔“ وہ لمبے بھر کے لیے سانس لینے کو رکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے کچن میں آکر جی ایم صاحب کو انٹرکام کیا اور بتایا، دودھ ختم ہو چکا ہے۔ اب جیسا وہ کہیں، میں نیچے سے دودھ لا کر ان کے لیے اور ان کے مہمان کے لیے چائے بنا دوں یا پھر ہوٹل سے بنی بنائی چائے لے کر آ جاؤں۔ انہوں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد مجھ سے کہا، تم نیچے جا کر دودھ لاؤ گے اور پھر چائے بناؤ گے تو اس میں اچھا خاصا وقت لگ جائے گا۔ تو صیف صاحب کو جلدی داپس جانا ہے اس لیے تم ایسا کرو کہ بنی بنائی چائے ہی ہوٹل سے پکڑ لاؤ..... لہذا میں چائے لینے ہوٹل کی طرف چلا گیا۔“

”استغاثہ کے مطابق، جب تم چائے لے کر واپس آئے تو مقتول کا ملاقاتی تو صیف احمد جا چکا تھا۔ تاخیر سے واپسی پر مقتول نے تمہیں خوب ڈانٹا اور چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔ تم غصے کی حالت میں کچن تک پہنچے۔ چائے کی بھری ہوئی چینک کو وہیں شیلف پر چھوڑا، ڈبل روٹی کاٹنے

والی چھری اٹھائی اور اسے چھپا کر مقتول کے کمرے میں پہنچ گئے۔ قرض نہ ملنے کی وجہ سے تمہارا دل پہلے ہی بہت دکھا ہوا تھا۔ موجودہ ڈانٹ ڈپٹ نے تمہارا دماغ خراب کر دیا اور طیش کے عالم میں تم نے اپنے جنرل منیجر خالد نظامی کو قتل کر دیا۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور ملزم سے پوچھا۔

”کیا سب کچھ استغاثہ کے دعوے کے عین مطابق پیش آیا تھا؟“
 ”بالکل نہیں جناب!“ ملزم نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ”استغاثہ اور اس کا دعویٰ جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ابھی آپ نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“

”پھر..... پھر حقیقت کیا ہے؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔
 ”یہ سچ ہے کہ ہوٹل پر مجھے کافی دیر ہوگئی تھی اور اس کی بھی ایک وجہ تھی جس کی تفصیل میں جا کر میں معزز عدالت کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ چائے والے کا ایک بندے سے جھگڑا ہو رہا تھا اسی سبب اسے چائے بنانے میں دیر ہوگئی تھی.....“ اتنا بتانے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس روز میں واپس دفتر نہیں آیا تھا بلکہ نیچے ہی سے گھر چلا گیا تھا.....“

”کیوں..... تم نیچے ہی گھر کیوں چلے گئے تھے؟“ میں نے مصنوعی سختی سے پوچھا۔
 ”تمہیں تو مقتول نے اپنے دوست کے لیے چائے لینے بھیجا تھا.....!“

”ہاں، چائے لینے تو بھیجا تھا لیکن اس سے پہلے کہ چائے تیار ہوتی، جی ایم صاحب اپنے دوست کے ہمراہ دفتر سے رخصت ہو گئے تھے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”میں جن کے لیے چائے لے کر جانے والا تھا جب وہی چلے گئے تو پھر میں دفتر جا کر کیا کرتا۔“
 ”تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ مقتول اور اس کا دوست دفتر سے جا چکے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تم تو اس وقت چائے کے ہوٹل پر کھڑے تھے؟“

”یہ بات مجھے عارف صاحب نے بتائی تھی۔“ ملزم نے جواب دیا۔
 ”لیکن عارف محمود صاحب کو تو تم دفتر میں بیٹھا چھوڑ کر نیچے گئے تھے؟“ میں نے حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ تمہیں کہاں مل گئے؟“

”یہ سچ ہے کہ میں عارف صاحب کو دفتر میں بیٹھا چھوڑ کر ہی چائے لینے گیا تھا بلکہ ان سے بھی چائے کے بارے میں پوچھا تھا اور انہوں نے چائے پینے سے انکار کر دیا تھا۔“ ملزم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جب میں چائے کے ہوٹل پر کھڑا تھا اور چائے تیار ہونے ہی والی تھی تو میں نے عارف صاحب کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ انہیں دیکھ کر میں ان کی طرف بڑھا تو انہوں نے مجھے بتایا۔“

”خالد نظامی اور ان کا دوست توصیف احمد تمہاری چائے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے اس لیے تھوڑی دیر پہلے وہ دفتر سے نکل گئے ہیں لہذا چائے وغیرہ کو بھول جاؤ اور گھر کی راہ پکڑو۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”اگر وہ چلے گئے ہیں تو مجھے دفتر بند کرنا ہوگا۔ میں اوپر جاتا ہوں۔“

”دفتر میں نے بند کر دیا ہے۔“ عارف صاحب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ ”مجھے بھی ایک جگہ وقت پر پہنچنا ہے اس لیے تمہارا انتظار کیے بغیر میں اٹھ آیا ہوں اور دفتر کو بھی لاک کر دیا ہے۔“

نظامی صاحب سے جب انٹرکام پر میری بات ہوئی تھی تو انہوں نے اس بات کی خاص طور پر تاکید کی تھی کہ میں جلدی چائے لے کر آؤں کیونکہ ان کے دوست توصیف کو زیادہ دیر تک وہاں نہیں بیٹھنا تھا۔ اس تناظر میں عارف صاحب کی بات دل کو گتی تھی کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ دفتر سے چلے گئے ہوں گے۔ چائے والے بندے کی لڑائی بھڑائی اتنی دلچسپ اور سنسنی خیز تھی کہ میں نظامی صاحب کی ہدایت کا خیال نہ رکھ سکا اور مجھے دیر ہو گئی۔

عارف صاحب نے مجھے متذبذب دیکھا تو پوچھا۔ ”کیا تمہیں اوپر دفتر میں کوئی کام تھا۔ اگر تمہارا دفتر میں جانا ضروری ہے تو جاؤ ورنہ گھر چلے جاؤ۔“

میں نے سوچا، جب عارف صاحب دفتر کو لاک کر ہی چکے ہیں تو میں اوپر جا کر کیا کروں گا۔ اگلے روز نظامی صاحب کی ڈانٹ سننا لازمی بات تھی لہذا میرا فی الحال گھر چلے جانا ہی مناسب تھا۔ میں نے عارف صاحب کے سوال کے جواب میں کہا۔

”دفتر میں مجھے تو کوئی کام نہیں اس لیے میں گھر ہی جا رہا ہوں۔“

اور پھر میں واقعی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اگلی صبح یعنی بارہ اکتوبر کو جب میں دفتر آنے کی تیاری کر رہا تھا تو پولیس نے مجھے نظامی صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا اور اس وقت سے لے کر اب تک میں ایک ملزم کی حیثیت سے ادھر ادھر گھسٹا جا رہا ہوں.....!“

ملزم نے طویل وضاحت ختم کی تو میں نے آخری سوال کیا۔ ”واقعات و شواہد کے مطابق، آدھی رات کو بھی مقتول کی ذاتی گاڑی بلڈنگ کے سامنے، سر دس روڈ کے کنارے پارک ملی تھی۔ جب تم نے گھر کی راہ پکڑی تو دیکھا نہیں تھا، نظامی صاحب کی نیوی بلیو مزدا کار وہاں موجود تھی؟“

”جناب! چائے کا ہوٹل بلڈنگ کی دوسری جانب، بغل میں واقع ہے۔ میں وہیں سے سیدھا گھر چلا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے جاتے وقت مقتول کی گاڑی وہاں موجود تھی یا نہیں۔“ ملزم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے عارف صاحب نے جب ان کے جانے کا بتایا تھا تو مجھے ان کی بات کا یقین آ گیا تھا۔“

”مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے حتیٰ لچھے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از اینڈ جارنڈ.....!“



آئندہ پیشی پر استغاثہ کی طرف سے تین گواہوں کو شہادت کے لیے عدالت کے کمرے میں لایا گیا۔ ان میں سے دو گواہ ایسے تھے جن کے بیانات اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں کوئی خاص بات نہیں تھی لہذا میں عدالتی کارروائی کے اس حصے کا ذکر گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

تیسرے گواہ کا نام توصیف احمد تھا اور یہ وہی شخص تھا جو وقوعہ کے روز مقتول سے ملنے ”خان ٹریڈرز“ کے آفس آیا تھا۔ گواہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا، اس کے بعد اپنا مختصر سا بیان

ریکارڈ کرا دیا۔

توصیف احمد کی عمر پچاس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک قدر آور اور اور صحت مند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ ونس باکس میں کھڑا بڑا مطمئن نظر آتا تھا۔ اس کے انداز و تاثرات میں کسی بے چینی و بے قراری کی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی گویا وہ اندر سے خاصا پرسکون تھا۔

بج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وکیل استغاثہ لگ بھگ پندرہ منٹ تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر اس نے جرح ختم کر کے مجھے ٹرن دے دی۔
میں اپنی باری پر ونس باکس کے قریب چلا گیا پھر استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا۔ ”توصیف صاحب! عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا کیسا لگ رہا ہے؟“

”ایک دم نارمل۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔
”کیا آپ کو پہلے بھی کبھی عدالت میں آکر گواہی دینے کا اتفاق ہوا ہے؟“
”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔“
”اس کے باوجود آپ ذرا بھی نروس دکھائی نہیں دیتے؟“ میں نے چہیتے ہوئے لہجے

میں پوچھا۔
وہ جلدی سے بولا۔ ”جس شخص کے ہاتھ پاؤں صاف ہوں وہ کہیں بھی چلا جائے، اسے نروس ہونے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔“

”دش گڈ.....!“ میں نے سرانہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”توصیف صاحب! وقوعہ کے روز آپ مقتول کے دفتر کتنے بجے پہنچے تھے؟“
”میرا خیال ہے.....“ وہ پُرسوج انداز میں بولا۔ ”میں اس روز پانچ پینتالیس یعنی پونے چھ بجے خالد نظامی کے پاس پہنچا تھا۔“

”توصیف صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ مقتول کے ساتھ آپ کے گھر سے دوستانہ مراسم تھے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”مقتول کی ناگہانی موت سے یقیناً آپ کو ذہنی دھچکا اور دلی صدمہ پہنچا ہوگا۔ میں آپ کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں لیکن یہ سوال وجواب میرے پیشے کا

تقاضا ہے اس کے لیے پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔“

استغاثہ کا گواہ، وکیل صفائی کی جانب سے اس نوعیت کے دوستانہ رویے کی عموماً توقع نہیں رکھتا لہذا تو صیف کا چونکنا اور متذبذب ہونا عین فطری رد عمل تھا۔ اس نے ایک لمحے کے کش و بچ کے بعد دھمے لہجے میں کہا۔

اس تعزیت اور دلی ہمدردی کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ بہر حال، آپ اپنے پیشہ ورانہ تقاضے اور فرائض ضرور نبھائیں۔ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”تھیک یو..... ویری مچ۔“ میں نے تشکرانہ انداز میں کہا پھر سوالات کے سلسلے کو آگے

بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”جب آپ مقتول سے ملے اس کے آفس پہنچے تو وہاں اور کون کون تھا؟“

”جناب! میں نے آفس کے ایک ایک کمرے میں تو جھانک کر نہیں دیکھا لیکن مقتول کی زبانی پتا چلا تھا کہ اس کے علاوہ صرف اکاؤنٹ آفس میں موجود تھا یا پھر آفس بوائے زاہد حسین۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مقتول خالد نظامی نے آپ کو غلط نہیں بتایا تھا۔ اس وقت درحقیقت یہی صورت حال تھی۔“ میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔

”کیا مقتول نے آپ کے سامنے ہی ملزم کو چائے کا کہا تھا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ ”لیکن آفس کے کچن میں دودھ ختم ہو گیا تھا لہذا مقتول نے ملزم کو ہدایت کی کہ وہ جلدی سے باہر جا کر ہوٹل سے چائے لے آئے۔“

”یہ..... جلدی سے جانے..... والی ہدایت شاید اس لیے کی گئی تھی کہ آپ کو کسی ضروری

کام سے کہیں اور جانا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ”تو کیا ملزم فنانٹ چائے لے کر آ گیا تھا؟“

”کوئی نہیں جناب.....!“ اس نے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے برا سامنہ بنایا۔ ”یہ تو ایسا گیا کہ پھر پلٹ کر واپس نہیں آیا۔“

”تو اس کا مطلب ہے.....“ میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس روز آپ چائے پیے بنا ہی اپنے دوست مقتول خالد نظامی کے دفتر سے رخصت ہو گئے تھے؟“

”جی ہاں.....!“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ معزز عدالت کو بتا سکتے ہیں کہ وقوعہ کے روز آپ مقتول کے پاس سے کتنے بجے رخصت ہوئے تھے؟“

”بہی کوئی چھ بیس..... یا چھ پچیس پر۔“ اس نے بتایا۔

”کیا مقتول بھی آپ کے ساتھ ہی دفتر سے اٹھ گیا تھا؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”میں اکیلا ہی وہاں سے رخصت ہوا تھا۔ مقتول کو ابھی کچھ دیر اور دفتر میں بیٹھ کر کام کرنا تھا۔“

”یعنی جب آپ دفتر سے نکلے اس وقت تک ملزم چائے لے کر واپس نہیں آیا تھا؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”بالکل نہیں!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا۔ ”مقتول، ملزم کی تاخیر کے باعث خاصا برہم تھا اور اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ جب یہ چائے لے کر واپس آئے گا تو وہ گرم چائے کی پیالی اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارے گا۔“

”لیکن افسوس کہ اس روز ملزم چائے لایا ہی نہیں بلکہ دفتر واپس آنے کے بجائے وہ اپنے گھر چلا گیا تھا اور مقتول کو اپنے غصے کے اظہار کا موقع نہ مل سکا بلکہ اسی روز وہ بد نصیب ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا گیا کہ اب وہ کسی پر غصہ کرنے یا ڈانٹنے کے قابل ہی نہیں رہا۔“ میں نے اس سرسری سے تبصرے کے بعد تھوڑا توقف کیا پھر وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔

”تو صیف صاحب! جب وقوعہ کے روز آپ لگ بھگ چھ پچیس پر مقتول کے پاس سے رخصت ہوئے تو کیا اس وقت خان ٹریڈرز کا اکاؤنٹ مسٹر غارف محمود اپنے کمرے میں موجود تھا؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں مقتول کے پاس سے اٹھا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر دفتر سے نکل گیا تھا۔ یہ بتانا میرے لیے ممکن نہیں کہ اس وقت عارف محمود دفتر میں موجود تھا یا نہیں۔“

”تھینک یو تو صیف صاحب!“ میں نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ”آپ نے میرے سوالات کے بالکل درست جوابات دیے ہیں۔ بس ایک آخری ٹیٹ باقی ہے۔ اس کے بعد آپ کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔“

”آخری ٹیٹ!“ وکیل استغاثہ نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا میرے فاضل دوست عدالت کے کمرے میں کوئی لیبارٹری کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”یہ ایک آزمائشی ٹیٹ ہوگا جو خالد نظامی کے اصلی قاتل تک راہ نمائی کرے گا..... یعنی میں اس ٹیٹ کے ذریعے مقتول کے قاتل کو بے نقاب کر دوں گا۔“ میں نے لحاقی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اصولی طور پر تو اس ٹیٹ میں صرف انہی افراد کو شامل کیا جائے گا جو وقوعہ کے روز شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک جائے واردات پر کسی نہ کسی طرح موجود رہے تھے کیونکہ انہی میں سے کوئی قاتل ہے۔ اگرچہ میری نظر میں آپ کا اس کیس میں قاتل کی حیثیت سے کوئی کردار نہیں لیکن پھر بھی اگر آپ اس ٹیٹ میں حصہ لینا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”مجھے اس قسم کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وکیل استغاثہ نے جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔“ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ”آپ کا نمائندہ اس ٹیٹ میں شامل ہے۔“

”میرا نمائندہ!“ شدت حیرت سے وہ اچھل پڑا۔ ”آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“

”میں اس کیس کے ملزم زاہد حسین کا ذکر کر رہا ہوں!“

”وہ تو آپ کا موکل ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”میرا نمائندہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”میرے فاضل دوست!“ میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔ ”اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملزم زاہد حسین میرا موکل ہے اور میں اسے اس کیس سے باعزت بری

کروانے کی کوشش کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا ہوں لیکن میرا موکل ہونے کے ساتھ ہی وہ استغاثہ کا نامزد ملزم بھی ہے، یعنی استغاثہ نے میرے موکل کو خالد نظامی کے قاتل کی حیثیت سے نامزد کر رکھا ہے، گویا ایک طرح سے ملزم، استغاثہ کا الزام شدہ نمائندہ ہے.....“ میں نے تھوڑا توقف کر کے ٹٹولنے والی نظروں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اگر میں پچھلے پانچ چھ ماہ سے ملزم کی وکالت کر رہا ہوں تو اس کا مطلب ہے، میں اسے بے گناہ سمجھتا ہوں لیکن میرے ایسا سمجھنے سے عدالت کو یقین نہیں آئے گا۔ وہ تو ہر معاملے کا ثبوت مانگتی ہے لہذا میں نے اپنے موکل کو بھی اس ٹیسٹ سے گزارنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔“

”اس سلسلے میں آپ کن افراد کا ٹیسٹ کریں گے؟“ جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔ ”اور یہ ٹیسٹ کس قسم کا ہوگا؟“

”جناب عالی!“ میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”حالات و واقعات کے مطابق، وقوعہ کے روز یعنی گیارہ اکتوبر کی شام صرف چار افراد، چھ اور آٹھ بجے کے درمیان جائے واردات پر موجود تھے۔ نمبر ایک ہے مقتول خالد نظامی، نمبر دو ملزم زاہد حسین۔ نمبر تین، مقتول کا دوست اور استغاثہ کا گواہ توصیف احمد۔ نمبر چار، خان ٹریڈرز کا اکاؤنٹنٹ اور استغاثہ کا سب سے اہم گواہ عارف محمود.....!“

میں نے تھوڑا توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد حاضرین عدالت پر ایک اپنی سی نگاہ ڈالی اور دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

”خالد نظامی کی گردن کٹی لاش جس انداز میں جائے وقوعہ پر پڑی ملی ہے اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی یعنی اسے متوقع قاتل نہیں سمجھا جاسکتا لہذا متذکرہ بالاسٹ میں سے اس کا نام خود بہ خود خارج ہو جائے گا۔ اس کے بعد زندہ افراد میں ملزم زاہد حسین کا نمبر پہلے آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خالد نظامی کو ملزم نے قتل نہیں کیا لیکن میں اسے بھی اس اپیشل ٹیسٹ سے گزاروں گا تاکہ عدالت کے سامنے حقائق کو آشکار کیا جاسکے۔ باقی دو افراد عارف محمود اور توصیف احمد ہیں۔ توصیف صاحب کا ٹیسٹ تو ابھی ملزم کے ساتھ ہی ہو جائے گا اور

عارف محمود جب عدالت کے کمرے میں نظر آئے گا تو اسے بھی دیکھ لیا جائے گا اور..... جہاں تک ٹیسٹ کی نوعیت کا تعلق ہے تو.....“ میں نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی خاموشی اختیار کی، اس کے بعد جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! یہ ایک انتہائی سادہ سائٹسٹ ہے اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ایک آدمی بھگت جائے گا۔ آپ دیکھتے جائیں.....“ پھر میں نے کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ توصیف احمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”توصیف صاحب! کیا آپ اس ٹیسٹ کے لیے تیار ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جی ہاں..... میں تیار ہوں۔“

”تو پھر آ جائیں، ہم جج صاحب کے پاس چلتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے بیگ میں سے رف پیڈ اور قلم نکال لیا۔ اس دوران میں توصیف وٹنس باکس میں سے نکل آیا تھا۔ میری اس ڈرامائی کارروائی پر عدالت میں موجود ہر شخص حیران و پریشان تھا۔ ان کے لیے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ عدالت کے کمرے میں عجیب سی سنسنی آمیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں استغاثہ کے گواہ توصیف احمد کو اپنے ساتھ جج کے پاس لے گیا اور رف پیڈ اور قلم اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ”آپ جج صاحب کی نظر کے سامنے اس پیڈ پر لکھیں کہ.....“ میں نے خالد نظامی کو قتل نہیں کیا..... اور اس لائن کے نیچے اپنے دستخط کر دیں۔“

توصیف نے الجھن زدہ نظروں سے یکے بعد دیگرے مجھے اور جج کو دیکھا لیکن کوئی سوال کیے بغیر اس نے جج کے سامنے وہ کام کر دیا جس کی میں نے اس سے فرمائش کی تھی۔

میں نے گواہ کے ہاتھ سے پیڈ اور قلم لے لیا پھر اس کا کندھا تھکتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ توصیف صاحب! آپ اس ٹیسٹ میں پاس ہو گئے ہیں۔ اب آپ واپس جا کر کٹہرے میں کھڑے ہو جائیں۔“

توصیف کے جانے کے بعد جج نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا میں نے مذکورہ پیڈ کے اس صفحے پر جہاں توصیف نے مختصر سی تحریر کے بعد دستخط کیے تھے، یہ جملہ لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”جناب عالی! آپ اس حقیقت کو دیکھ چکے ہیں کہ استغاشہ کا گواہ تو صیف احمد دائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے، یعنی وہ رائٹ ہینڈ ہے!“

جج نے میرا لکھا ہوا جملہ ملاحظہ کیا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس کے بعد، میں نے یہی عمل ملزم زاہد حسین کے ساتھ بھی دہرایا اور اس کی تحریری کارکردگی والے صفحے پر بھی ویسا ہی جملہ لکھ کر جج کے سامنے رکھ دیا۔

میرے استفسار پر جج نے اس مرتبہ بھی سرکواثباتی جنبش دی۔

میں مذکورہ دونوں صفحات جج کی میز پر چھوڑ کر واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ وکیل استغاشہ کافی

دیر سے صبر کیے کھڑا تھا، وہ مزید انتظار نہ کر سکا اور اضطرابی لہجے میں بولا۔

”جناب عالی! ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے فاضل دوست نے کیا ٹیسٹ کیا

ہے اور اس ٹیسٹ سے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں؟“

جج نے وکیل استغاشہ کی تسلی کی خاطر صاف صاف بتا دیا۔ ”ڈیفنس کونسل نے یہ ثابت کیا

ہے کہ استغاشہ کا گواہ اور ملزم دائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا شمار رائٹ ہینڈ افراد

میں ہوتا ہے اور..... جہاں تک نتائج کا تعلق ہے، یہ تو وکیل صاحب ہی بتائیں گے!“

”میرے فاضل دوست!“ وکیل استغاشہ نے میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تو اس ٹیسٹ کی کیا رپورٹ ہے جو ابھی ابھی آپ نے نہایت ہی خفیہ طریقے سے معزز عدالت

کے سامنے کیا ہے؟“

حاضرین عدالت کے علاوہ اس کیس کا انکوائری آفیسر بھی بڑی تشویش اور دلچسپی سے

میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے کھنکھ کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جیسا کہ محترم جج صاحب نے بتایا ہے کہ استغاشہ کا گواہ تو صیف احمد اور کیس کا ملزم

زاہد حسین دائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہیں جنہیں انگریزی میں رائٹ ہینڈ کہا جاتا ہے۔“

میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جائے وقوعہ کا نقشہ، لاش کی حالت اور پوزیشن اس بات کی گواہ ہے کہ مقتول خالد

نظامی کا قتل کسی ایسے شخص نے کیا ہے جو بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہو..... یعنی لیفٹ ہینڈ

ہے لہذا..... تو صیف احمد اور زاہد حسین میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہو سکتا۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“ انکوائری آفیسر نے اضطرابی انداز میں کہا۔
میں نے آئی۔ او کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گنہگار لہجے میں جواب دیا۔ ”قادر بخش صاحب! آپ نے بڑی باریک بینی سے لاش کا معائنہ کیا تھا اور بڑی احتیاط سے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا تھا، یہ نکتہ تو آپ کو پکڑ لینا چاہیے تھا.....!“ میں نے لمحے بھر کو خاموش ہو کر انکوائری آفیسر کو گھورا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ میرا مخاطب جج تھا۔

”جناب عالی! میں نے گزشتہ پیشی پر آپ سے وعدہ کیا تھا کہ انکوائری آفیسر کے انٹرویو سے میں نے جو ”عظیم مقصد“ حاصل کیا ہے وہ میں آئندہ کسی پیشی پر معزز عدالت کے سامنے ضرور لاؤں گا اور یہ ایسا ہی موقع ہے کہ میں اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کر دوں۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں ایک مرتبہ پھر توقف کیا۔ جج گہری دلچسپی سے میری جانب متوجہ تھا۔ میں نے سلسلہ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! مقتول کی کرسی کمرے میں ایسی پوزیشن سے لگی ہوئی تھی کہ اول تو، دائیں ہاتھ سے کام کرنے والے کے لیے اس پر..... خاص طور پر اس کی گردن پر حملہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار اور مقتول کی گردن کے بیچ اتنا فاصلہ نہیں تھا کہ لمبے پھل والی چھری کو آزادانہ گھما کر اس کی گردن کو نشانہ بنایا جاتا اور اگر بالفرض محال، ایسا ہوا بھی تھا تو اس صورت میں مقتول کی گردن بائیں جانب کان کے نیچے سے کٹنا چاہیے تھی جبکہ حقائق یہ ہیں کہ مقتول کی گردن دائیں جانب کان کے نیچے سے کٹی تھی جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ کسی لیفٹ ہینڈڈ شخص نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جو کارگر ثابت ہوا اور مقتول پلک جھپکنے میں اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو گیا.....“

”میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا.....“ آئی او نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔
”واقعی، یہ تو بڑا اہم نکتہ ہے.....“

”آپ کا اس طرف دھیان نہیں گیا تو کوئی بات نہیں، میں اب اس جانب آپ کی توجہ دلارہا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ جائے وقوعہ کے نقشے کو ذہن میں تازہ کریں اور پوری سچائی و ایمانداری سے بتائیں کہ خالد نظامی کا قاتل کون ہو سکتا ہے..... لیفٹ ہینڈڈ

یارائٹ ہینڈو؟“

اس نے بغیر کسی تذبذب اور مخمضے کے جواب دیا۔ ”قاتل نے وہ خطرناک حملہ بائیں سے کیا تھا..... یعنی وہ لیفٹ ہینڈ تھا۔“

”اور میرا موکل ایک سوا ایک فیصد رائٹ ہینڈ ہے۔“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! آپ نے خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا کہ ملزم دائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے جبکہ آئی اوصاحب فرما رہے ہیں کہ قاتل یقیناً لیفٹ ہینڈ ہے لہذا.....“ میں نے لچاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے اس لیے اس کی باعزت بریت کے احکام صادر فرمائے جائیں۔ دیش آل یور آنر.....!“

جج نے گھور کر انکو آری آفیسر کی طرف دیکھا اور غصیلے انداز میں کہا۔ ”اس کا تو یہ مطلب ہوا، پورا استغاثہ ہی گڑ بڑ ہے؟“

”جناب عالی!“ تفتیشی افسر گھلیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ لیفٹ رائٹ کی غلطی تو بہر حال ہوئی ہے.....“

”لیفٹ رائٹ کی غلطی انسان کو جنت کے بجائے دوزخ میں پہنچا دیتی ہے۔“ جج نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ عدالت تمہیں حکم دیتی ہے کہ سات یوم کے اندر نیا چالان پیش کیا جائے اور اب.....“ جج نے ذرا توقف کیا پھر غصیلے لہجے میں کہا۔

”اب لیفٹ رائٹ کی کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے!“

اسی وقت وکیل استغاثہ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری ”وہ لیفٹ ہینڈ شخص کون ہو سکتا ہے جس نے جی ایم کا خون کیا.....؟“

”اگر میں یہ کہوں کہ میرے فاضل دوست لیفٹ ہینڈ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے آپ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو یہ بڑی نازیبا بات ہوگی۔“ میں نے ایک ایک لفظ کو طنز میں بھگو کر وکیل مخالف کی سماعت پر مارتے ہوئے کہا۔ ”لہذا میں بس اتنا عرض کروں گا کہ لیفٹ ہینڈ قاتل کو آپ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں تلاش کریں۔ آپ کو بڑی آسانی سے قاتل مل جائے گا۔ ویسے آپ چاہیں تو خان ٹریڈرز کے آفس جا کر بھی یہ پتا لگا سکتے ہیں کہ میں نے جن

چار افراد کو سرکل کیا تھا ان میں بائیس ہاتھ سے کام کرنے کا عادی کون ہے۔ آپ کی آسانی، سہولت اور مدد کے لیے اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں نے ابھی تک قاتل کا عدالتی ٹیسٹ نہیں لیا؟“

”ایسا تو صرف ایک ہی شخص ہے۔“ وکیل استغاثہ کی پُر تشویش آواز ابھری۔ ”خان

ٹریڈرز کا اکاؤنٹ عارف محمود.....!“

”میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن

بزرگوں کے کہے ہوئے کو کہنے سے بھی باز نہیں آؤں گا کہ..... عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا

ہے اور بے عقل کے لیے.....؟“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔



آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کر دیا۔

وکیل استغاثہ کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ انکوائری آفیسر نے خود کو عقل

مند ثابت کرتے ہوئے میرے اشارے کو بہ خوبی سمجھ لیا تھا اور اس مرتبہ اس نے لیفٹ رائٹ کی

غلطی کیے بغیر بالکل ”صحیح“ آدمی پر ہاتھ ڈالا تھا یعنی..... عارف محمود کو حوالہ عدالت کر دیا تھا۔

عارف نے پولیس کھڈی ہی میں اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ وہ لیفٹ ہینڈ تھا اور اسی

نے کمپنی کے جی ایم صاحب کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے اس نے

وقوعہ کے روز زاہد حسین کو قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کیا اور غلط بیانی کر کے اسے دفتر آنے

کے بجائے واپس گھر بھیج دیا تاکہ اگلے روز جب وہ دفتر آئے تو فوراً جی ایم کے قتل کے الزام میں

دھر لیا جائے اور نی الواقعہ ایسا ہی ہوا بھی تھا۔

تفصیل کے مطابق، جنرل منیجر خالد نظامی ایک ایماندار اور اصول پرست شخص تھا۔

جب سے اس نے یہ کمپنی جو ان کی تھی، وہ افراد سخت تکلیف میں تھے جو کسی نہ کسی حوالے سے کمپنی کو

نقصان پہنچا کر اپنے گھر بھر رہے تھے اور عارف محمود ایسے افراد میں سرفہرست تھا۔ وقوعہ سے تین ماہ

پہلے مقتول نے اکاؤنٹ کا ایک سنگین فراڈ پکڑ لیا تھا جس کے لیے اکاؤنٹ کو باس کے سامنے بری

طرح ذلیل ہونا پڑا تھا۔ اپنی ذلت اور رسوائی کا بدلہ لینے کے لیے وہ موقع کی تاک میں رہا اور

جب زاہد حسین کو لون سے منع کر دیا گیا اور وہ اپنا غبار نکالنے کے لیے ادھر ادھر بیٹھ کر جی ایم کے خلاف باتیں کرنے لگا تو عارف کو زاہد کی شکل میں ایک قربانی کا بکرانظر آ گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جنرل نیجر کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارے گا کہ اس قتل کا الزام زاہد حسین کے سر چلا جائے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ..... جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے؟

جو لوگ اصول پرست اور ایماندار ہوتے ہیں، انہیں قدم قدم پر دشواریوں اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات یہ مخالفت ان کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ خالد نظامی کے ساتھ پیش آیا.....!



مصیبت زدہ

اگر موسم خوش گوار، حالات سازگار اور ہوا موافق رخ کی ہو تو رائی کو پہاڑ بننے میں ایک لمحہ نہیں لگتا۔ بعض واقعات انتہائی معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن غیر معمولی انداز میں پیش آنے سے ان کی اہمیت خطرناک حد تک بلند ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے!

ایک روز میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا کلائنٹس کو ڈیل کر رہا تھا کہ ایک پریشان، ادھیڑ عمر شخص مجھ سے ملنے آیا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ میرے پاس آنے والے لوگ کسی نہ کسی پریشانی یا الجھن کا شکار ہوتے ہیں اور مجھ سے قانونی مشورے اور مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں مسائل سے نجات مل جائے۔ میں اپنی پیشہ ورانہ عادت کے مطابق، مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ان کا استقبال کرتا ہوں، ان کا احوال سنتا ہوں اور جس حد تک ممکن ہو، اپنی فیس وصول کرنے کے بعد ان کی مدد بھی کرتا ہوں۔

میں نے مذکورہ ادھیڑ عمر شخص کو سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ چکا تو میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مطلب یہی تھا..... ”جی جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میرا نام معظم علی ہے۔“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ”عسکری صاحب نے آپ کے بارے میں بتایا تھا اس لیے یہاں آیا ہوں..... آپ عسکری صاحب کو تو جانتے ہیں نا؟“

معظم علی کا انداز بہت ہی دھیمہ اور سلجھا ہوا تھا۔ وہ اپنی آواز اور لب و لہجہ سے ایک پڑھا لکھا، معزز اور شریف الطبع انسان محسوس ہوتا تھا۔ میرے شناساؤں میں عسکری حضرات کی

تعداد تین سے متجاوز تھی لہذا صرف عسکری صاحب کہنے سے میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ معظم علی کا اشارہ کس عسکری کی طرف تھا چنانچہ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”معظم صاحب! آپ کس عسکری کا ذکر کر رہے ہیں؟“

”شبیر عسکری!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ جو ایجوکیشن

ڈیپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں!“

”اچھا وہ.....!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے کہا پھر معظم علی کی

پریشان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ بھی انہی کے آفس میں ہوتے ہیں؟“

”میں ان کے آفس میں تو نہیں ہوتا البتہ ان سے کام پڑتا رہتا ہے اس لیے وہاں جانا

بھی پڑتا ہے۔“ وہ پریشان ہونے کے باوجود متحمل لہجے میں بولا۔ ”میرا تعلق بھی ایجوکیشن

ڈیپارٹمنٹ ہی سے ہے..... بلکہ تھا!“ وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں پچھلے سال ہی ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ریٹائرڈ

ہیڈ ماسٹر معظم علی سے پوچھا۔ ”عسکری صاحب نے میرے لیے کیا پیغام بھیجا ہے؟“

شبیر عسکری محکمہ تعلیم میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ میری ان سے اچھی یاد اللہ

تھی۔ معظم علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”انہوں نے مجھے صرف آپ کا نام، پتا اور یہاں تک پہنچنے کا راستہ بتایا ہے۔ میں اپنے

کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ عسکری صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی ہے اور مجھے یقین

دلایا ہے کہ آپ میرا کام کر دیں گے۔“

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر سوالیہ انداز میں اس کے چہرے کی جانب دیکھتے

ہوئے پوچھا۔ ”جی معظم صاحب! فرمائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

جواب دینے سے پہلے وہ مجھے کچھ متذبذب نظر آیا۔ ممکن ہے، وہ اپنا مسئلہ بیان کرنے

کے لیے ذہن میں موجود خیالات کو کسی ایک نقطے پر مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے گہرے

پتلون پر دھاری دار شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دراز قامت اور جسم مائل بہ فرہی۔ سر اور مونچھوں کے

بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ رنگت سانولی اور ہاتھ پاؤں کا مضبوط۔ میں نے پہلی نظر میں اس کی

عمر کا جو اندازہ قائم کیا تھا وہ بعد ازاں، قدرے غلط ثابت ہوا۔ وہ ساٹھ کے ہند سے کو عبور کر چکا تھا۔ ”بیک صاحب!“ چند لمحات کے غور و فکر کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں

دراصل اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہوں۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے جیل میں بند ہے۔“

”آپ کے بیٹے کا نام کیا ہے؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پیڑ پر قلم چلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اور وہ دو ہفتے سے جیل میں کیوں بند ہے؟“

”اس کا نام کامران علی ہے۔“ معظم علی نے بتایا۔ ”یہ میری اکلوتی اولاد ہے اور..... وہ قتل کے الزام میں جیل گیا ہے۔“

”عدالت سے سزا سننے کے بعد کیا.....؟“

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”نہیں جناب! سزا اور جزا کا مرحلہ تو ابھی دور ہے۔ عدالت نے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوایا ہے۔ کیس عدالت میں لگ چکا ہے۔ چار روز بعد پیشی ہے۔“

”یہ کیس کس عدالت میں ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

اس نے ایک جج اور عدالت کا نام بتادیا۔

میں نے کہا۔ ”آپ کا بیٹا کامران علی قتل کے الزام میں پچھلے پندرہ دن سے جیوڈیشل ریمانڈ پر ہے۔ اس کا مطلب ہے، پولیس نے گرفتاری کے بعد اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کیا ہوگا اور مذکورہ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان عدالت میں پیش کر دیا ہوگا۔ عدالت نے آپ کے بیٹے کو جیل کی راہ دکھا دی۔ اس دوران میں..... آپ نے اپنے بیٹے کی ضمانت کرانے یا رہائی کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں؟“

”کامران کی گرفتاری کے فوراً بعد میں نے اس کے لیے ایک وکیل کا بندوبست کیا تھا۔“

معظم علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”لیکن اس کی کارکردگی تسلی بخش نہیں رہی۔ اس نے زبانی جمع خرچ کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ ضمانت کے حق میں اس کے دلائل بھسپے ثابت ہوئے اور عدالت نے کامران کو جیل بھیج دیا۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، ایک بوجھل سانس چھوڑی اور اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس دوران شبیر عسکری سے میری ملاقات ہوئی۔ انہیں میرے بیٹے کی گرفتاری کا علم ہو چکا تھا۔ جب میں نے انہیں صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا تو انہوں نے فوراً مجھے وکیل بدلنے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہا کہ میں تو کسی اچھے وکیل کو نہیں جانتا۔ اس پر انہوں نے ایک لمحہ سوچا پھر بولے، آپ جا کر بیک صاحب سے مل لیں۔ میرا سلام کہیں اور انہیں اپنے مسئلے کے بارے میں بتائیں..... اور میں آپ کے پاس آ گیا ہوں!“

”ٹھیک ہے۔“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ”پہلے والا وکیل کس پوزیشن میں ہے؟“

”وہ اب کسی بھی پوزیشن میں نہیں ہے۔“ معظم علی مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں اسے فارغ کرنے کے بعد آپ کی طرف آیا ہوں۔ یہ کیس اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

”یہ کیسے میرے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسی کے الفاظ دہرائے پھر کہا۔ ”لیکن ابھی تک مجھے اس کیس کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں..... ہے نا؟“

ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر معظم علی نے بڑی رسائی سے کہا۔ ”آپ پوچھیں جناب، کیا پوچھنا ہے!“

میں نے پوچھا۔ ”مقتول کون تھا؟“

”مقتول کا نام ایوب تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اور وہ ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں چوکیدار تھا۔“

”یہ اپارٹمنٹس بلڈنگ کہاں پر واقع ہے؟“ میرے استفسارات میں تیزی آتی گئی۔ ”اور آپ کے بیٹے کا مران علی کا ایوب سے کیا تعلق تھا؟“

”اپارٹمنٹس بلڈنگ کا نام ’الفرید اپارٹمنٹس‘ ہے اور یہ بلڈنگ کریم آباد کے علاقے میں واقع ہے۔“ معظم علی نے جواب دیا۔ ”میرے بیٹے کا ایوب نامی چوکیدار سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی کسی قسم کی دوستی یا دشمنی.....“

”پھر؟“ وہ لمحہ بھر کے لیے تھما تو میں نے فوراً سوال جڑ دیا۔ ”جب مقتول کا آپ کے بیٹے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا تو پھر ایوب کے قتل کے الزام میں اسے گرفتار کیوں کیا گیا؟“

”معمظم علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”بیک صاحب! بات دراصل یہ ہے

کہ وقوعہ سے چند روز پہلے کامران کا اس چوکیدار سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ان کے بیچ اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی، ہاتھ پائی کی نوبت آنے ہی والی تھی کہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ بہر حال، اس ناخوشگوار واقعے سے لے کر وقوعہ تک ان دونوں کے درمیان کھینچاؤ کی سی کیفیت رہی تھی اسی لیے.....“ وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، تھوک نکل کر حلق تر کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”..... جب چوکیدار ایوب اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا تو لوگوں کا فوری طور پر دھیان کامران ہی کی طرف گیا اور پولیس نے بھی انہی خطوط پر کارروائی کرتے ہوئے میرے بیٹے کو گرفتار کر لیا۔ یہ ہے ساری کہانی جناب!“

”معظم صاحب! کیا آپ کی رہائش بھی الفرید اپارٹمنٹس ہی میں ہے؟“ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”نہیں جناب.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم لوگ پی آئی بی کالونی میں رہتے ہیں۔“

”کہاں پی آئی بی کالونی اور کہاں کریم آباد؟“ میں نے الجھن زدہ نظروں سے معظم علی کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا بیٹا وہاں کہاں پہنچ گیا تھا اس چوکیدار سے الجھنے؟“

”جناب! کامران کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کی ڈیوٹی جس علاقے میں لگا دی جائے، اسے جانا پڑتا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کا صاحب زادہ کرتا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ایک کوریئر کمپنی میں ملازم ہے۔“ معظم علی نے بتایا۔ ”اس کے ذمے ڈاک کی ترسیل ہے۔ کمپنی اسے جو بھی علاقہ دے دے، اسے اپنی ڈیوٹی انجام دینا ہوتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ کریم آباد اور اس کے گرد و نواح میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہا تھا۔“

معظم علی نے مجھے مذکورہ کوریئر کمپنی کا نام بھی بتایا تھا لیکن بہ وجوہ میں یہاں پر وہ نام ظاہر نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی سہولت اور کہانی کی ضرورت کے پیش نظر اس کوریئر کمپنی کا نام ”فلاننگ ہارس“ فرض کر لیں۔

میں نے مزید پندرہ بیس منٹ تک مختلف زاویوں سے گھما پھرا کر متعدد سوالات کیے جن

کے معظم علی نے تسلی بخش جوابات دیے جس کے نتیجے میں، میں نے کامران علی کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ متکفی شدہ تھا اور لگ بھگ دو ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی تھی مگر اب یہ ممکن نہیں نظر آتا تھا۔ پچھلے پندرہ دن سے وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے قیام پذیر تھا اور آئندہ کتنے عرصے تک وہ کیس چلے گا اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کر دوں تا کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے معظم علی اور اس کے بیٹے کامران علی کی زبانی معلوم ہوئی تھیں، باقی میں نے بہ ذات خود بعد میں اس علاقے کا سروے کر کے جانی تھیں جہاں وقوعہ پیش آیا تھا۔ آئندہ پیشی سے پہلے میں نے جیل جا کر ملزم کامران علی سے ایک ملاقات بھی کر لی تھی۔ اس نوعیت کے بہت سے کام میرا در دوسر نہیں ہوتے کہ میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کے مانند موقع بہ موقع اور کوچہ بہ کوچہ گھومتا پھروں۔ اکثر دکان چکروں میں نہیں پڑتے اور میری طرح جو محدودے چند ایسا کرتے ہیں، انہیں حیرت انگیز کامیابی ملتی ہے۔



معظم علی کی پوری زندگی پرسکون، بے داغ اور خوشحال گزری تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک شریف النفس انسان تھا۔ کامران علی اس کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ بھی اب ستائیس اٹھائیس سال کا ہو چکا تھا۔ بی کام کرنے کے بعد وہ عملی زندگی میں کود پڑا تھا لیکن چونکہ تربیت ایمان داری، شرافت اور سچائی کے ماحول میں ہوئی تھی اس لیے روزگار کے سلسلے میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، جیسا کہ عموماً ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ اس دنیا کا انوکھا اور ”مثالی“ معاشرہ ہے۔ معظم علی سفارش اور رشوت کے سخت خلاف تھا لہذا اس قسم کی صورت حال میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ اس پر طرہ یہ کہ کامران کے ساتھ کچھ مقدر کا بھی پھیر تھا۔ جو ملازمت اسے پسند آتی، وہاں سے کچھ عرصے بعد اسے فارغ کر دیا جاتا اور جس قسم کی جائز آسانی سے مل جاتی تھیں، ان میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ کافی زگ زیک اور لوٹ پوٹ کے بعد بالآخر وہ کوریئر کمپنی میں لگ گیا تھا۔ ”فلاننگ ہارس“ میں کام کرتے ہوئے اسے اب لگ بھگ دو سال ہو گئے تھے۔

کریم آباد اور اس کے آس پاس کا علاقہ اس کی ذمے داریوں میں شامل تھا۔

میں نے چونکہ خود اس گلی کا سروے کیا تھا جس میں الفرید اپارٹمنٹس بلڈنگ واقع تھی اس لیے وہاں کی صورت حال اور مکانیت کا مجھے بہ خوبی علم تھا۔ مین روڈ سے ایک کشادہ گلی شروع ہوتی تھی جو کچھ آگے جا کر تنگ ہو جاتی تھی۔ حکومت کے متعلقہ محکمے میں وہ گلی آغاز سے اختتام تک ایک جیسی چوڑائی کی حامل تھی لیکن نصف سے آگے جا کر بعض مکینوں کی من مانی نے مذکورہ گلی کو سکڑنے اور سمنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ کام ایک سہراہے پر ہوا تھا۔

مین روڈ سے گلی میں داخل ہوں تو دائیں جانب بنگلوں کی لائن تھی اور بائیں طرف اپارٹمنٹ بلڈنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ بنگلوں والی سائڈ میں، ایک امام بارگاہ اور دو پرائیویٹ سکول بھی واقع تھے۔ تھوڑا آگے آئیں تو وہ سہراہا آ جاتا تھا جہاں سے گلی کو اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر، زیادتی کرنے والے آس پاس کے مکینوں کی بودوباش کی خاطر خود کو سکڑنا پڑا تھا۔ اس سہراہے پر ایک چھوٹی سی مکہ بکری تھی۔ اس کے سامنے، اسی کے ساز کی بخاری ملک شاپ واقع تھی۔ ایک چھوٹا سا گلی نمائیسرا راستہ اسی ملک شاپ کے پاس سے نکل کر پیٹرول پمپ کی طرف چلا جاتا تھا جبکہ اصل سکڑی سٹی ہوئی گلی بالکل سیدھی آگے جاتی تھی۔ ان اتھورائزڈ مکانوں کی بدھوتی نے مذکورہ گلی کا سائز تقریباً آدھا کر رکھا تھا۔ مکہ بکری کے بعد قربان آنا چکی اور اس کے سامنے بسم اللہ جنرل اسٹور اور پھر ضمیر پلازا کے بعد وقفے وقفے سے کارپینٹرز کی دودکانیں بھی تھیں۔ اس گلی کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ پروجیکشن کو اچھی طرح سمجھ جائیں۔

مقتول ایوب الفرید اپارٹمنٹس کا چوکیدار تھا اور کامران علی کے والد کے مطابق، وقوعہ سے چند روز پہلے مقتول اور ملزم کے بیچ اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی اور اس تلخ کلامی کا سبب الفرید اپارٹمنٹس کی ایک مکین مسز شبانہ تھیں جو بلاک اے کے فلیٹ نمبر تین سو چار میں اپنے اکلوتے آٹھ سالہ بیٹے علی رضا کے ساتھ رہتی تھیں۔ شبانہ کا شوہر رضوان پچھلے پانچ سال سے کسی یورپی ملک میں بہ سلسلہ روزگار گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں شبانہ اور علی رضا کو فلیٹ میں اکیلے رہنا پڑ رہا تھا۔

”الفرید اپارٹمنٹس“ کے دو بلاک تھے۔ اے اور بی۔ یہ عمارت گراؤنڈ پلس فور تھی، یعنی پانچ منزلہ۔ بلاک اے کے ہر فلور پر چھ فلیٹ تھے یعنی کل تیس فلیٹس اور بلاک بی کے ہر فلور پر سات فلیٹ تھے، مطلب یہ کہ کل پینتیس فلیٹس۔ اس طرح اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں فلیٹس کی کل تعداد

پینٹھ بنتی تھی اور مسز شبانہ اے۔ تین سو چار میں رہائش پذیر تھیں۔ یعنی..... بلاک اے، تھرڈ فلور، فلیٹ نمبر چار۔ یہ دو کمرے اور ایک کامن پر مشتمل چھوٹا سا فلیٹ تھا جس کا قہر لگ بھگ پانچ سو مربع فٹ بنتا تھا۔

مذہب کا مران علی چونکہ اسی علاقے میں ”فلاننگ ہارس“ والوں کی ڈاک پہنچایا کرتا تھا لہذا دیگر گھروں اور بلڈنگز کے علاوہ وہ الفرید اپارٹمنٹس میں بھی جایا کرتا تھا اور حالات و واقعات کے مطابق..... وہ اس رہائشی عمارت میں مسز شبانہ کے فلیٹ میں کچھ زیادہ ہی جایا کرتا تھا!

الفرید اپارٹمنٹس کے چکیدار ایوب سے تو اس کا جھگڑا بہت بعد میں ہوا، اس سے پہلے چند ایک بد مزگیاں محلے والوں سے بھی ہو چکی تھیں جن میں سرفہرست تنازع ریاض نامی ایک آدمی سے تھا جو ضمیر پلازا میں رہتا تھا۔ کامران علی کے کام کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی کہ اسے موٹر بائیک استعمال کرنا پڑتی۔ سیکر اور فیلڈ کا کام کرنے والوں کی یہ مجبوری ہے۔ ان دنوں کامران نے اس گلی میں نیانیا آنا شروع کیا تھا اور اتفاق سے پہلے تین لیٹر ہی الفرید اپارٹمنٹس کے تھے جو دو دو، تین تین دن کے وقفے سے آئے تھے اور یہ ڈاک مسز شبانہ کی تھی۔

غیر متعلقہ افراد کی گاڑیوں کا چونکہ بلڈنگ میں داخلہ ممنوع تھا لہذا جب کامران، مسز شبانہ کے فلیٹ کی طرف جاتا تو اسے اپنی بائیک بلڈنگ کے گیٹ کے باہر گلی میں دیوار کے ساتھ کھڑی کرنا پڑتی تھی۔ ایک روز وہ اوپر سے نیچے آیا تو بائیک کے دونوں ٹائر زمین سے لگے ہوئے تھے..... یعنی انہیں ہوا سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ شاید کسی بچے نے شرارت میں اس کی راہ کھوٹی کرنے کا ”اہتمام“ کر دیا ہے۔ یہ اس نے دیکھا تھا کہ اس گلی میں ہر عمر کے بچے کھیلنے رہتے تھے۔

کامران نے یہ بھی دیکھا تھا کہ الفرید اپارٹمنٹس کے سامنے جوان اتھورائز گھروں کی لائن تھی ان کی عورتیں اکثر اپنی دہلیزوں پر بیٹھی گپ شپ کرتی رہتی تھیں۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ الفرید اور ضمیر نامی یہ دو رہائشی عمارتیں بالکل رو بہ رو نہیں تھیں بلکہ ان کے درمیان پوزیشن کے حوالے سے تیس چالیس گز کا فاصلہ تھا۔ کامران چند لمحات تک پریشانی کے عالم میں اپنی بائیک کو دیکھتا رہا پھر وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا۔

اس نے بائیک موڑی تو اپنے دروازے کے سامنے بیٹھی ایک عمر رسیدہ موٹی عورت نے

پوچھا۔ ”کیا ہو گیا بھائی تمہاری موٹر سائیکل کو؟“

”کسی بچے نے شاید اس کی ہوائیال دی ہے۔“ کامران نے مجھے ہوئے دل سے کہا۔
 ”یہ بچے بڑے شیطان ہیں۔“ دوسری بولی۔ ”پتا نہیں، آج کل کی اولاد کو ہو گیا ہے،
 کسی کی سنتے ہی نہیں۔ میں تو کہتی ہوں، یہ بے چاری موٹر سائیکل ہے۔ اگر ان شیطانوں کے ہتھے
 ہاتھی بھی چڑھ جائے تو یہ اس کی بھی ہوائیال دیں گے۔“

”مجھے تو لگتا ہے، تمہاری موٹر سائیکل پتھر ہو گئی ہے۔“ موٹی عورت نے بڑی ماہرانہ نظر
 سے بائیک کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ”اگر کوئی ہوائیال لٹا تو میری نگاہ سے بچ نہیں سکتا تھا۔ یہ سب
 ہمارے سامنے ہی تو کھیل رہے تھے۔“

”اے، بہن، تم نگاہ کی بات کرتی ہو، پہلی والی ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔“ یہ ہمارے دور
 کے بچے نہیں ہیں جو ہماری پکڑ میں آجائیں۔ یہ تو ایسی فنکاری سے کام کرتے ہیں کہ بس..... اللہ کی
 پناہ!“ بات ختم کرتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں کو کانوں تک پہنچا دیا۔

کامران کو ان کی باتوں اور تبصروں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ویسے یہ بات اس کے
 ذہن میں بھی آ رہی تھی کہ ممکن ہے، بائیک پتھر ہو گئی ہو۔ بہر حال..... وہ بائیک کو دھکیلے ہوئے مین
 روڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس گلی سے باہر نکلیں تو چند قدم کی دوری پر ایک پیٹرول پمپ تھا۔ وہاں
 ایک مکینک بھی بیٹھتا تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ پہلے وہ بائیک کا کام کرائے گا پھر آگے بڑھے گا۔
 وہ ضمیر پلازا کے سامنے سے گزرنے لگا تو وہاں ریاض کھڑا دکھائی دیا۔ وہ ریاض کو نام
 سے نہیں، صرف صورت سے پہچانتا تھا۔ وہ جب بھی اس گلی میں آتا تھا، ریاض اپنے پلازا کے آس
 پاس کہیں نہ کہیں اسے کھڑا نظر آ جاتا تھا۔ کامران، ریاض کے پاس سے گزرا تو ایک تلخ خودکلامی
 اس کی سماعت تک پہنچی۔

”ابھی تو صرف بائیک کی ہوائیال دی ہے۔ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو تمہاری
 زندگی کے غبارے میں سے بھی ہوائیال دی جائے گی!“

کامران نے بے ساختہ پلٹ کر ریاض کی طرف دیکھا، وہ گردن اٹھائے آسمان کو تیک
 رہا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ دھمکی آمیز الفاظ ریاض نے
 کامران کے لیے ادا کیے تھے کیونکہ اس وقت نہ تو کسی اور کی بائیک وہاں کھڑی تھی اور نہ ہی کسی کی

بائیک کے ٹائروں میں سے ہوا نکلی تھی۔ ریاض کا یہ واضح اشارہ اسی کی جانب تھا۔ کامران کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ ریاض کی اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔

وہ کسی قسم کا الجھاؤ پیدا کیے بغیر خاموشی کے ساتھ بائیک دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ مذکورہ پیٹرول پمپ پر پہنچ کر اس نے اپنی بائیک کا ”معائنہ“ کروایا تو ملکینک نے اس کی بائیک کو ”مرض“ سے پاک قرار دیتے ہوئے دونوں ٹائروں میں ہوا بھر دی۔

”الفرید اپارٹمنٹس“ سے واپسی کے سفر میں وہ بڑی شدت سے سوچ رہا تھا کہ آخر اس شخص نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا حالانکہ وہ اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ بعد ازاں، اسے اس کا نام پتا چل گیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو زیادہ الجھانے کے بجائے یہ فیصلہ کیا کہ اب جب بھی وہ اس گلی میں آئے گا تو ریاض پر نظر پڑتے ہی وہ اس سے یہ ضرور پوچھے گا کہ اس نے اس کی بائیک کی ہوا کیوں نکلوائی تھی۔ ”نکلوائی تھی“ اس لیے کہ یہ بات بالکل واضح تھی، ریاض نے بہ ذات خود بائیک کے پاس بیٹھ کر یہ کام نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس کا یہ ”کارنامہ“ ان عورتوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا جو اپنی اپنی دہلیز پر بیٹھی گپ شپ کرتی رہتی تھیں۔

اس واقعے کو تین چار دن گزر گئے۔ کامران ایک طرح سے اسے بھول ہی گیا تھا۔ کوئی ہفتے بھر بعد اسے ایک لیٹر ڈیلیور کرنے کے لیے اس گلی میں پھر جانا پڑا۔ لیٹر پر گولڈن اسکوار کا پتا لکھا ہوا تھا۔ یہ اس گلی کی آخری رہائشی عمارت تھی جس کے سبب مذکورہ گلی ”بندگلی“ کا اعزاز حاصل کر لیتی تھی۔ کامران نے دیکھا کہ ریاض اپنی بلڈنگ ضمیر پلازا کے سامنے ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے خاموشی سے بائیک آگے بڑھادی کہ واپسی میں وہ ریاض سے بات کرے گا۔ ریاض پر نظر پڑتے ہی بائیک کی ہوا نکلنے کا واقعہ اس کی یادداشت میں تازہ ہو گیا تھا۔

واپسی میں کامران نے ضمیر پلازا کے سامنے بائیک کی اسپیڈ کم کی تو اس کے کسی استفسار سے پہلے ہی ریاض نے پوچھ لیا۔

”کیوں ڈاکیا بابو..... کافی دنوں سے بلبل کا کوئی لیٹر نہیں آیا؟“ اس کے انداز میں زہریلا طنز گھلا ہوا تھا جسے کامران نے پوری شدت سے محسوس کیا۔ تاہم کوئی سخت جواب دینے کے بجائے اس نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ”آپ کس بلبل کا ذکر کر رہے ہو بھائی..... اور آپ کا نام

”کیا ہے؟“

”میرا نام ریاض احمد ہے۔“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ”اور میں جس بلبل کا ذکر کر رہا ہوں وہ ادھر اے۔ تین سو چار میں رہتی ہے۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے الفرید اپارٹمنٹس کی جانب انگلی اٹھادی۔

یہ عمارتیں اور دیگر بے جان اشیاء اگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتیں تو ان انسانوں کے ساتھ وہ خوب لڑائی جھگڑا کرتیں جو بات بے بات ان پر انگلی اٹھانے کے عادی ہیں۔ بہر حال، الفرید اپارٹمنٹس کی پانچ منزلہ عمارت نے ریاض کی حرکت پر اف تک نہ کی البتہ کامران بہ خوبی سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس جانب تھا۔ اس نے ریاض سے پوچھا۔

”آپ مسز شبانہ کی بات کر رہے ہو؟“

”دیکھا..... تمہارا دماغ ٹھیک ادھر ہی پہنچانا.....!“ ریاض نے چوٹ کی۔

”بھائی! اے۔ تھری زیرو فور میں تو مسز شبانہ ہی رہتی ہیں۔“ کامران نے ریاض کے رویے کے جواب میں خشک لہجے میں کہا۔ ”میں وہاں ڈاک دینے جاتا رہتا ہوں اس لیے جانتا ہوں۔ اس میں دماغ کے ٹھیک وہاں پہنچنے والی کون سی بات ہے.....؟“

”وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں ڈاک کیا بابو!“ ریاض اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کافی دنوں سے تمہارا اس فلیٹ میں جانا نہیں ہوا۔ کیا کوئی ناراضی ہو گئی ہے؟“

ریاض کا یہ انداز کامران کو سخت ناگوار گزر رہا تھا لیکن وہ پھر بھی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ”میرا کام کوریئر لیٹر کو اس کے ایڈریس پر پہنچانا ہے۔ میری کسی سے کوئی دوستی یا رشتہ داری تو ہے نہیں کہ ناراضی کا سوال پیدا ہو۔ جب میرے پاس مسز شبانہ کے لیے کوئی لیٹر ہوگا ہی نہیں تو میں خواجہ اس کے گھر کی گھنٹی کیوں بجاؤں گا۔“

”گھنٹی کیوں بجاؤں گا اور اس کے گھر میں جا کر کیوں بیٹھوں گا!“ ریاض نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے گھورا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہے نا..... میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟“

کامران علی کوئی ننھا بچہ یا مٹی کا مادھو نہیں تھا کہ وہ ریاض کے لہجے کی ٹون کو سمجھ نہ پاتا۔ اسے فوری طور پر یہ اندازہ ہو گیا کہ ریاض کو، اس کا مسز شبانہ نے تیسرے پھیرے پر اسے اندر بلا کر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔ کامران کی نظروں میں مسز شبانہ ایک خوبصورت اور خوش

اخلاق عورت تھی لیکن ریاض کی طنزیہ باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مسز شبانہ کے آس پاس کسی کو دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ میرا، مسز شبانہ کے گھر میں داخل ہونا آپ کو پسند نہیں آیا!“
 کامران نے حتی الامکان اپنا لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کا مسز شبانہ سے کیا رشتہ ہے..... کیونکہ میری معلومات کے مطابق، مسز شبانہ اور اس کا اکلوتا بیٹا علی رضا اس فلیٹ میں رہتے ہیں۔ شبانہ کا شوہر رضوان روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ کراچی میں اس کے قریبی رشتے دار (میکے والے) نہ ہونے کے برابر ہیں اور کریم آباد کی اس گلی میں تو بالکل نہیں ہیں۔ اس صورت حال میں آپ.....؟“

کامران نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو ریاض معنی خیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تو دو تین ملاقاتوں میں آپ نے بلبل کا پورا شجرہ نسب بھی حفظ کر لیا۔ واہ بھئی واہ.....“ وہ لمبے بھر کے لیے سانس لینے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ”آپ“ سے ”تم“ پر اتر آیا تھا۔

”مسز شبانہ سے میرا کیا رشتہ ہے، تم اس چکر میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ ہاں، یہ حقیقت ہے کہ تمہارا وہاں جانا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اس گلی اور اس علاقے سے دور ہی رہو تو تمہارے حق میں بہتر ہے.....!“

اس کے رویے کو دیکھتے ہوئے کامران نے بھی تم کا صیغہ پکڑ لیا اور یہ پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔ ”تو کیا اس روز تم نے ہی میری بایک کے ٹائروں کی ہوا نکلائی تھی اور..... واپسی میں جب میں تمہارے پاس سے گزر رہا تھا تو تم نے مجھے سنانے کے لیے یہ کہا تھا، ابھی تو صرف بایک کی ہوا نکلی ہے۔ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو تمہاری زندگی کے غبارے میں سے بھی ہوا نکال دی جائے گی.....؟“

”لگتا ہے، تم ایک عقلمند انسان ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اللہ کرے، دوسرے عقل مندوں کی طرح میرا اشارہ تمہاری سمجھ میں بھی آ جائے۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہو گا کہ تم مسز شبانہ سے دور رہو اور..... کمپنی سے درخواست کر کے اپنا تبادلہ کسی اور علاقے میں کرا لو۔“
 کامران کو اس کی باتیں زہر محسوس ہو رہی تھیں۔ ریاض خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ”تم

کون ہو اور تمہارا مسز شبانہ سے کیا معاملہ ہے، مجھے قطعاً اس سے کوئی غرض نہیں۔ جہاں تک میری نوکری کا تعلق ہے تو تم بھی کان کھول کر سن لو، میں اپنی ڈیوٹی کہیں اور لگوانے والا نہیں ہوں۔ اس علاقے اور اس گلی میں جس کے نام جو بھی لیٹر آئے گا، میں وہ ضرور پہنچاؤں گا۔ وہ گھر مسز شبانہ کا بھی ہو سکتا ہے اور تمہارا بھی.....!“

اتنا کہہ کر کامران نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور آگے بڑھانے سے قبل مڑ کر ریاض کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے معنی خیز انداز میں اوپر نیچے گردن کو حرکت دے رہا تھا۔ کامران اس کی پروا کیے بغیر روانہ ہو گیا۔

کامران نے مجھے بتایا کہ اس واقعے کا اس نے زیادہ اثر نہیں لیا تھا۔ اس نے اپنا کام حسب معمول جاری رکھا۔ جب بھی اس کا اس گلی میں آنا ہوتا، ریاض کو وہ ضمیر پلازاکے آس پاس کہیں نہ کہیں کھڑے دیکھتا۔ اگر ان کی نگاہیں مل جاتیں تو کامران کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور ناپسندیدگی کے تاثرات واضح نظر آتے۔ ایک روز، کوئی ہفتے بھر بعد جب وہ مسز شبانہ کی ڈاک لے کر الفرید اپارٹمنٹس پہنچا تو اس نے سوچا، ریاض کے سلسلے میں وہ مسز شبانہ سے بات کرے گا تاکہ پتا تو چلے آخروہ کس مرض اور کس تکلیف میں مبتلا ہے!

حسب معمول مسز شبانہ نے آج بھی اسے گھر کے اندر بلا لیا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد وہ آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ مسز شبانہ نے اسے پانی پلایا اور دستخط کرنے کے بعد پتالیٹر وصول کر لیا۔ اب کامران کے لیے مزید وہاں بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں تھا مگر اٹھنے سے پہلے اس نے پوچھ لیا۔

”میڈم! کیا آپ ریاض کو جانتی ہیں جو سامنے والی بلڈنگ ضمیر پلازما میں رہتا ہے؟“
ریاض کا نام سن کر مسز شبانہ کے چہرے اور آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے جواب دیا تو اس کے لہجے میں اکتاہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

”میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتی، البتہ مجھے اتنا ضرور پتا ہے کہ وہ ایک فارغ اور آوارہ شخص ہے۔ لگتا ہے، اسے دنیا میں کوئی کام کاج نہیں۔ یا تو وہ اپنی بلڈنگ کے گیٹ کے باہر کھڑا رہتا ہے یا پھر اپنے گھر کی کھڑکی میں نظر آتا ہے۔ اگر ان دونوں مقامات پر نہ پایا جائے

تو پھر وہ ضمیر پلازما کی چھت پر دکھائی دے گا اور جب وہ چھت پر ہوگا تو ہمیشہ ٹراؤزراور بنیان میں۔ میری نگاہ میں وہ ایک بے ہودہ اور بے غیرت انسان ہے.....!“

”میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں میڈم!“ کامران نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بھی اس کو بالکل ایسا ہی پایا ہے۔“

”کیا آپ سے اس کی کوئی بد مزگی ہو گئی ہے؟“ شبانہ نے چونک کر کامران کی جانب دیکھا۔

اس سوال کے جواب میں کامران نے مسز شبانہ کو وہ کہانی سنا دی جو بانیٹ کی ہوائی نکلنے سے شروع ہو کر ریاض کے عزائم اور دھمکی آمیز انداز تک دراز تھی۔ اس نے کھلے الفاظ میں شبانہ کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ریاض نے اس کے حوالے سے کامران کو باور کرانے کی کوشش کی تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔

”میڈم! وہ کمینہ تو آپ کے بارے میں یوں بات کر رہا تھا جیسے آپ اس کی ملکیت ہوں۔“

”میرا اس سے اور اس کی بے ہودگی سے کوئی تعلق نہیں کامران صاحب!“ شبانہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آئیں، میں آپ کو دکھاتی ہوں، وہ اس وقت بھی اپنے کچن میں کھڑکی میں یا پھر چھت پر کھڑا ہوگا.....“

اتنا کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے نکلی اور بیڈ روم میں داخل ہو گئی۔ کامران بھی اس کے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔ شبانہ نے بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھیں سامنے..... ذیل شخص کچن کی کھڑکی میں موجود ہے اور ادھر ہی دیکھ رہا ہے جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ..... میرے فلیٹ میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔“

مسز شبانہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے بیڈ روم کی کھڑکی میں سے ضمیر پلازما بڑا واضح دکھائی دیتا تھا اور ریاض اس وقت واقعی وہاں کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ضمیر پلازما کے سیکنڈ فلور کے ایک فلیٹ کے کچن کی کھڑکی میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔

”یہ اس کا اپنا فلیٹ ہے۔“ مسز شبانہ واپس ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے بولی۔

”جہاں وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہے لہذا اس فلیٹ کے کچن میں یا اس بلڈنگ کی

چھت پر جا کر کھڑے ہونا کوئی معیوب بات نہیں لیکن وہ جن بھوکے نظروں سے مجھے اور میرے فلیٹ کو دیکھتا ہے وہ اخلاقیات کے زمرے میں نہیں آتا۔ وہ اکثر ضمیر پلازا کے گیٹ پر کھڑے ہو کر بھی ادھر ہی گھورتا رہتا ہے۔ جب کبھی اتفاق سے ہماری نظریں مل بھی جائیں تو وہ بڑے واہیات انداز میں مسکرا دیتا ہے۔“

”یہ تو خاصی افسوس ناک اور خراب صورت حال ہے۔“ کامران نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا شو ہر بھی یہاں موجود نہیں۔ اس فلیٹ میں آپ اپنے نو عمر بیٹے کے ساتھ رہتی ہیں۔ کسی وقت کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا ہے.....!“

”انشاء اللہ! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ مسز شبانہ نے پورے وثوق سے کہا۔ ”میں بھی اسی لیے خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کر رہی ہوں کہ رضوان ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ میں اس معاملے کو ایسا دیکھتا ہوں کہ خود کو تماشائے بنانے کے حق میں نہیں ہوں ورنہ میں ریاض کی بیوی کو ساری صورت حال سے آگاہ کر کے ایک نیا تنازع کھڑا کر سکتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں، اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا سوائے میری مشہوری کے..... اس علاقے کے جن لوگوں کو اس معاملے کا نہیں پتا وہ بھی جان جائیں گے کہ میں ہی وہ عورت ہوں جس پر چپکے چپکے ریاض دانت تیز کر رہا ہے۔ میں کوئی فساد نہیں چاہتی کامران صاحب! مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور یہاں گزارنا ہے اور میں یہ وقت کسی نہ کسی طرح نکال ہی لوں گی۔“

مسز شبانہ کا آخری جملہ کامران کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جو چیز سمجھ میں نہ آنے وہ ذہن کو ضرور الجھا دیتی ہے۔ اس نے بھی الجھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”میڈم! ایک سال کے بعد کیا ہونے والا ہے؟“

”رضوان کو پاکستان سے باہر گئے لگ بھگ پانچ سال ہو گئے ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس دوران میں وہ صرف ایک بار، کوئی دو سال پہلے ہم سے ملنے آئے تھے اور ایک ماہ ہمارے پاس رہ کر واپس چلے گئے تھے۔ اب وہ وہاں پوری طرح سیٹ ہو چکے ہیں اور ہمیں بھی اپنے پاس بلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دن پہلے رضوان کا جولیئر مجھے موصول ہوا ہے اس میں انہوں نے بتایا تھا کہ ایک سال کے اندر اندر وہ ہمیں اپنے پاس بلا لیں گے۔ ان کی کوشش رنگ لانے والی ہے۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ کامران نے مسز شبانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا..... ”ویسے میڈم! آپ بڑی ہمت والی خاتون ہیں جو ان حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہیں۔“

”جو لوگ نامساعد حالات کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں، کامیابی صرف انہی کے حصے میں آتی ہے۔“ شبانہ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”زندگی کی جنگ اتنی آسان اور سیدھی نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں اور کامرانی کو آپ کے قدم چومنے سے فرصت نہ ملے۔“ کامران نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں آپ کے خیالات کی تائید کرتا ہوں۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھ لیا۔

”میڈم! آپ کے شوہر کون سے ملک گئے ہوئے ہیں اور وہ وہاں کیا کرتے ہیں؟“ رضوان نے دراصل ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں تعلیم حاصل کر رکھی ہے اور اسی فیلڈ کا انہیں تجربہ بھی ہے۔ ”شبانہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”پانچ سال پہلے، وہ پاکستان سے آئرلینڈ گئے تھے۔ ایک سال کم و بیش آئرلینڈ میں گزارا مگر وہاں سیٹ نہیں ہو سکے پھر کوشش کر کے وہ انگلینڈ آ گئے اور جب سے وہیں پر ہیں۔ رہائش بریڈ فورڈ کے ایک علاقے لیوٹن میں ہے جو مختصر طور پر ”لیوٹن بیڈز“ کہلاتا ہے اور جانب کا نیچر ٹیکسٹائل ڈیزائننگ ہے۔“ ”بریڈ فورڈ تو یو کے کی ایک کاؤنٹی ہے جسے بریڈ فورڈ شائر کہا جاتا ہے۔“ کامران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری دعا ہے، اللہ آپ کو جلد از جلد اپنے شوہر کے پاس پہنچا دے تاکہ ریاض جیسے کینے انسان کی حریصانہ نظروں سے آپ محفوظ ہو جائیں۔“ ”آمین.....!“ شبانہ نے خلوص دل سے کہا۔

کامران اس سے اجازت لے کر گھر سے نکل آیا۔ اس روز کے بعد سے وہ جب بھی مسز شبانہ کے لیے کوئی لیٹر لے کر وہاں پہنچتا، وہ اسے گھر کے اندر بلا کر چائے وغیرہ ضرور پلواتی تھی۔ کامران نے مجھے بتایا تھا کہ شبانہ ایسی پرکشش، حسین اور جاذب نظر عورت کی معیت میں وقت گزارنا اسے بڑا بھلا اور خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ وہ بھی چند ملاقاتوں میں کامران سے اتنی فری ہو گئی تھی کہ اس کے انداز اور گفتگو سے اپنا تہمت جھٹکنے لگی تھی۔ وہ کامران سے زندگی کے ہر موضوع

پر آزاد نہ بات کر لیتی تھی۔ کامران نے بھی اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پہلے دن کی بد مزگی کے بعد کامران نے پھر کبھی ریاض کے منہ لگنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس نے کامران کو روک کر کسی بات چیت کی ضرورت محسوس کی، البتہ وہ جن نظروں سے کامران کو گھورتا رہتا تھا اس سے کامران بہ خوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اپنے دل و دماغ میں اس کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتا ہوگا۔ ایسے فتنہ پرور لوگوں سے الجھنا ٹھیک نہیں ہوتا..... اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے کامران نے اپنا کام جاری رکھا۔

چند روز بعد ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ کامران حسب معمول اپنی بایک کو الفریدا پارٹمنٹس کے گیٹ کے قریب کھڑی کر کے مسز شبانہ کو ایک لیٹر دینے گیا۔ واپسی میں آٹھ دس منٹ لگ گئے۔ جب وہ زینے سے اتر کر اپنی بایک کے پاس پہنچا تو وہ کروٹ کے بل زمین پر ”لیٹی“ ہوئی تھی۔ بایک چلانے والے حضرات اور اس کے بارے میں معلومات رکھنے والے لوگ بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کامران اور اس کی بایک کا کیا حال ہوا ہوگا.....؟“

کامران کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ شرارت ریاض ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنے ”مجرم“ کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ کامران نے بایک کو اپنے قدموں پر کھڑا کیا پھر ڈاک والے محفوظ ڈبے کو سیٹ کرنے لگا۔ اگر ان لمحات میں ریاض اسے کہیں کھڑا دکھائی دے جاتا تو ممکن تھا، ان کے بیچ جھڑپ ہو جاتی۔ کامران کا دل و دماغ اس کی طرف سے غم و غصے سے بھر چکا تھا۔ بہر حال، وہ جی کو جلاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

آئندہ کے لیے اس نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ جب بھی اس کا الفریدا پارٹمنٹس میں آنا ہوتا، وہ اپنی بایک کو گیٹ سے اندر لا کر رہائشیوں کی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے برابر میں کھڑا کر دیتا۔ دو تین پھیروں کے بعد ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک مرتبہ وہ اپنی بایک پارک کر کے زینے کی جانب بڑھا تو چوکیدار ایوب سے اس کا سامنا ہو گیا۔ ایوب نے اس سے کہا۔ ”بھائی صاحب! آپ اپنی گاڑی اندر نہیں کھڑی کر سکتے۔ اسے باہر لے جائیں۔“

”لیکن میں تو پہلے بھی دو تین مرتبہ بایک کو اندر پارک کر چکا ہوں۔“ کامران نے الجھن زدہ نظروں سے چوکیدار کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں اب کیوں اعتراض ہو رہا ہے؟“

”آپ کی وجہ سے صدر صاحب نے مجھے بہت ڈانٹا ہے۔“ چوکیدار وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جو لوگ اس بلڈنگ کے رہائشی نہیں ہیں وہ اپنی گاڑیوں کو اندر نہیں لاسکتے۔ آپ کی بائیک کو صدر صاحب نے اندر کھڑے دیکھا تھا اسی لیے مجھے خوب سنائیں..... آپ مہربانی کر کے اسے باہر لے جاؤ۔“

کامران نے محسوس کیا کہ اس جاہل آدمی کے ساتھ بحث و تکرار کا کوئی فائدہ نہیں لہذا وہ یہ کہتے ہوئے اپنی بائیک کو باہر لے گیا۔

”ٹھیک ہے، میں صدر صاحب سے خود بات کر لوں گا۔“

”صدر صاحب“ سے مراد ”الفرید اپارٹمنٹس“ کی کمیٹی کا صدر تھا۔ کامران، حاجی اشرف نامی اس شخص کو صورت سے پہچانتا تھا۔ حاجی اشرف ”اشرف بھائی“ کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک معقول اور شریف انفس انسان تھا۔ کامران کو یقین تھا کہ اگر وہ اشرف بھائی کو اپنی پرابلم کے بارے میں بتائے گا تو وہ یا تو اس کا مسئلہ حل کر دے گا یا پھر اسے بلڈنگ کے اندر بائیک کھڑی کرنے کی اجازت دیدے گا۔

وہ اپنی بائیک کے ساتھ عمارت کے گیٹ سے باہر نکلا تو بے ساختہ اس کی نگاہ ضمیر پلازا کے گیٹ کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں ریاض اپنے ہی قماش کے ایک آدمی کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ ریاض، کامران کی جانب دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر اس پر چوٹ کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا.....

”بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے.....!“

ریاض کا یہ طنز یہ تبصرہ اس بات کا تین ثبوت تھا کہ چوکیدار ایوب نے کامران کے ساتھ جو بھی سلوک کیا تھا وہ اس سے واقف تھا گویا وہ پہلے سے جانتا تھا، چوکیدار اسے اندر بائیک کھڑی نہیں کرنے دے گا۔ اس صورت حال میں کامران کا ذہن اس امر کی جانب بھی گیا کہ یہ سب ریاض ہی کا چلایا ہوا چکر تو نہیں۔ ریاض نے ایوب کو فیض کیا ہوا اور ایوب نے صدر صاحب کے کندھے پر بندوق رکھ کر کامران کو فائر کر دیا ہو.....!

یہ سب امکانات تھے اور حقیقت صرف اسی وقت سامنے آتی جب کامران بے ذات خود حاجی اشرف سے ملاقات کر لیتا۔

اس نے ریاض کو نظر انداز کرتے ہوئے بائیک بلڈنگ کی دیوار کے ساتھ لگائی اور زینے طے کرتے ہوئے مسز شبانہ کے فلیٹ اسے۔ تین سو چار میں پہنچ گیا۔ لیٹر ڈلیور کرنے کے بعد اس نے شبانہ کو تھوڑی دیر پہلے رونما ہونے والے تلخ واقعے سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی ان عزائم کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ بلڈنگ کے کمیٹی صدر سے ریاض کے بارے میں کھل کر بات کرے گا۔

شبانہ اس کی بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”کامران صاحب، اگر آپ ریاض کی ذات کے حوالے سے اشرف بھائی سے کوئی بات کریں گے تو لامحالہ میرا ذکر بھی آئے گا پھر یہ باتیں سننے کو ملیں گی کہ ریاض ایک خاص حوالے سے مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے اور وہ آپ کے ساتھ اس لیے دشمنی کر رہا ہے کہ اس کی دانست میں، میں آپ میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ یہ ایک اور جھگڑے والا معاملہ ہوگا..... نہیں، مجھے یہ قطعاً پسند نہیں ہوگا کہ اس بلڈنگ میں اور اس بلڈنگ کے باہر کسی بھی زاویے سے میرا چرچا ہو۔“ وہ لمبے بھر کو متوقف ہوئی، ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”کامران صاحب! آپ کو جو بھی کرنا ہے وہ کریں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ کہیں بھی میرا نام نہیں آنا چاہیے.....!“

”میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا مسز شبانہ!“ وہ پرسوج انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا اور ”خدا حافظ“ کہہ کر اس کے فلیٹ سے رخصت ہو گیا۔

ابتدا میں..... جب ریاض والا تنازع اٹھا تھا اور کامران نے محسوس کیا تھا کہ وہ شبانہ کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی جارحیت دکھا رہا ہے تو اس نے سوچا تھا، اس چکر سے اپنی ٹانگ باہر کھینچ لے۔ یہ اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ کوریئر کمپنی والوں سے کہہ کر اپنے ڈیوٹی کسی اور علاقے میں لگوا سکتا تھا۔ کمپنی والوں کو جب یہ پتا چلتا کہ کسی بھی حوالے سے ان کے کسی در کر کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کا امکان ہے تو وہ کامران کو اس جھیلے میں رکھنے کے بجائے فوراً اسے جائے وقوعہ سے ہٹا دیتے۔ اس کی جگہ کسی دوسرے در کر کو وہ علاقہ سونپ دیا جاتا۔ لیکن کامران نے ایسا نہیں چاہا اور نہ ہی کوریئر کمپنی کو اپنے مسائل سے آگاہ کیا اور اس کے اس فیصلے کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ نمبر ایک، اسے ریاض اور اس کے رویے سے چڑسی ہو گئی تھی بلکہ اس کے اندر ایک ضد نے جنم لے لیا تھا..... ریاض کی کمینگی کا مقابلہ کرنے کی ضد۔ ریاض کی بے ہودگی جیسے جیسے

بڑھ رہی تھی، کامران کے اندر اس کا مقابلہ کرنے کی ضد بھی اسی رفتار سے بڑھتی جا رہی تھی۔ نمبر دو، مسز شبانہ اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ ایک متغنی شدہ شخص تھا اور چند ماہ کے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی مگر شبانہ کی معیت میں چند منٹ بھی گزرا تا اسے بہت خوش گوار اور کیف آور محسوس ہوتا تھا۔ اس میں کامران کی خواہش سے زیادہ شبانہ کی مسحور کن شخصیت کا اثر تھا۔ وہ کسی تازہ گلاب کے مانند کھلی کھلی اور خوشبودار تھی۔ اس کی صحبت میں مقناطیسی اور برقی لہریں پورے ماحول کو حصار میں رکھتی تھیں۔ ریاض کو ”دکھن“ بے وجہ نہیں تھی!

چند روز بعد وہ گولڈن اسکوائر کی ڈاک لے کر آیا تو الفرید اپارٹمنٹس کے سامنے سے گزرتے ہوئے اشرف بھائی پر اس کی نظر پڑ گئی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اشرف بھائی پانی والی موٹر کے پاس کھڑا تھا۔ موٹر میں شاید کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ مکینک موٹر کے پاس بیٹھا ہاتھ پاؤں کا لے کر رہا تھا۔ اشرف بھائی اپنی نگہ رانی میں موٹر کا کام کروا رہا تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے بلڈنگ کے اندر چلا گیا۔ مسز شبانہ سے کیا ہوا وعدہ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اس نے اشرف بھائی کو سلام کیا اور کہا۔

”آپ کو تپتا ہوگا، میں ایک کوریئر کمپنی کی جانب سے اس علاقے میں آتا ہوں!“

”ہاں، یہ بات میرے علم میں ہے۔“ اشرف بھائی نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ ”میں نے آپ کو اس علاقے میں دیکھا ہے اور آپ ہماری بلڈنگ میں بھی لیٹر وغیرہ لے کر آتے رہتے ہو۔“

”آپ سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے اشرف بھائی!“ کامران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں بھائی، حکم کرو.....!“ اشرف بھائی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کامران نے اپنے مسئلے کو اپنے تک محدود رکھتے ہوئے گہری تنبیذ کی سے کہا۔ ”اس علاقے میں میرے ساتھ کبھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا لیکن آپ کی بلڈنگ کے باہر بایک کھڑی کرتے ہوئے دو تین ناخوشگوار واقعات پیش آئے ہیں۔ میرے پاس جو لیٹرز ہوتے ہیں وہ ایک طرح سے لوگوں کی امانت ہیں۔ اگر ان میں سے خدا نخواستہ کوئی ادھر ادھر ہو گیا تو میری شامت آ جائے گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ اشرف بھائی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے اور یہ کہ..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

کامران نے شبانہ اور ریاض کا نام لیے بغیر اشرف بھائی کو اپنے مسئلے سے آگاہ کیا اور آخر میں درخواست کی۔ ”جناب! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب میں آپ کی بلڈنگ کا کوئی لیٹر وغیرہ لے کر آؤں تو مجھے بائیک اندر کھڑی کرنے سے نہ روکا جائے۔“

”اس گلی کے شیطان بچوں کو تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ، ان سے عاجز ہوں حالانکہ اپنے دروازوں کے سامنے بیٹھی عورتیں مسلسل انہیں لعن طعن کرتی رہتی ہیں۔ بہر حال.....“ اشرف بھائی پان منہ میں رکھنے کے لیے متوقف ہوئے پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ اپنی بائیک گیٹ سے اندر لے آیا کرو۔ اگر آپ کا مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے تو اچھی بات ہے!“

کامران نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”اشرف بھائی! آپ کا چوکیدار کہیں نظر نہیں آ رہا؟“

”اسے میں نے ایک ہارڈویئر والے کی دکان پر بھیجا ہے۔“ اشرف بھائی نے جواب دیا۔ ”اس کھلی ہوئی موٹر کے لیے کچھ سامان کی ضرورت تھی..... آپ کو ایوب سے کیا کام ہے؟“

”میں چاہتا ہوں، آپ چوکیدار کو میری بائیک اندر کھڑی کرنے کے بارے میں بتا دیں۔“ کامران وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے دنوں میں حفاظت کے خیال سے بائیک گیٹ سے اندر لے آیا تھا لیکن چوکیدار نے یہ کہہ کر مجھے بلڈنگ کے اندر بائیک کھڑی نہیں کرنے دی تھی کہ صدر صاحب، یعنی آپ کی اجازت نہیں ہے.....!“

”ایوب نے آپ سے کچھ بھی غلط نہیں کہا بھائی۔“ اشرف بھائی نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”غیر متعلقہ افراد کی گاڑیوں کو اندر لانے پر میں نے ہی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ چند سال پہلے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے تھے کہ مجبوراً اس اصول پر عمل کرنا پڑا۔ بہر حال.....“ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوئے پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ مطمئن ہو کر جائیں۔ میں چوکیدار کو آپ کے بارے میں بتا دوں گا، آئندہ اس

سلسلے میں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

کامران نے اشرف بھائی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے واپس آ گیا۔

اس واقعے کے آٹھ روز بعد کامران کو الفریڈ اپارٹمنٹس میں جانے کا اتفاق ہوا اور وہ بھی مسز شبانہ ہی کا لیٹر لے کر۔ جب وہ ضمیر پلازا کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس نے ریاض کو گیٹ کے پاس کھڑے دیکھا۔ وہ کامران کو دیکھ کر بڑے تحقیر آمیز انداز میں مسکرایا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ کامران اس پر توجہ دیے بغیر الفریڈ اپارٹمنٹس میں داخل ہوا اور بڑے اطمینان سے اپنی بائیک اندر کھڑی کر کے زینے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ زینے طے کر کے تھرڈ فلور پر پہنچا اور اس کے فلیٹ کی کھنٹی بجادی۔ شبانہ نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ڈاکیے اور کوریئر سروس کے نمائندوں کے لیے عموماً لوگ اپنے ڈرائنگ روم کا دروازہ نہیں کھولتے۔ انہیں مین گیٹ ہی سے نمٹا دیا جاتا ہے البتہ، اگر کسی کے ساتھ انڈر شیڈنگ ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ مسز شبانہ اور کامران کے مابین بھی ذہنی ہم آہنگی کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی میں ذہنی فرحت اور تازگی محسوس کرتے تھے۔ کامران کی نیت میں کوئی کھوٹ تھا اور نہ ہی شبانہ کے دل میں کوئی میل۔ وہ غیر محسوس انداز میں باہمی اعتماد کی ڈور میں بندھ گئے تھے مگر یہ ڈور، یہ تعلق ریاض کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ان کی نیت پر شک کرتا تھا اور دل ہی دل میں ان کے کردار پر کیچڑ اچھالتا تھا۔ حسد اور جلن کی آگ بڑی خطرناک ہوتی ہے، یہ اندر ہی اندر انسان کو جلا کر رکھ کر دیتی ہے!

اس روز مسز شبانہ نے اسے چائے پلاوائی لہذا واپسی میں پندرہ سے بیس منٹ لگ گئے اور جب وہ زینے اتر کر واپس آیا تو ایک نئی مصیبت اس کی منتظر تھی۔ اس نے بائیک کو گیٹ سے باہر نکالا اور اشارت کرنے کی کوشش کرنے لگا..... کوشش ان معنوں میں کہ وہ اشارت ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں آیا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ بے ساختہ اس کی نظر ضمیر پلازا کی جانب اٹھ گئی۔ ریاض وہاں موجود تھا اور اس کی طرف دیکھ کر بڑے طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

کامران نے بائیک کے مختلف حصوں کو ”چیک“ کرنے کے بعد اس کے اشارت نہ ہونے کا سبب جان لیا۔ بائیک کی ٹینکی میں سے سارا پیٹرول نکال لیا گیا تھا۔ اس نے آج صبح ہی

بائیک کی ٹنکی فل کروائی تھی۔ اس نے بائیک کو ادھر ہی کھڑا کیا اور چوکیدار کو تلاش کرنے لگا۔

جب وہ بلڈنگ کے اندر پہنچا تو اس وقت چوکیدار ایوب اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا مگر اب وہ اپنے کمرے میں چار پائی پر بیٹھا دکھائی دے گیا۔ چوکیدار کا کمر بلڈنگ کے آخری کنارے پر پانی والی موٹر کے پاس ہی بنا ہوا تھا۔ کامران اس کے پاس پہنچا اور پوچھا۔
”میری بائیک میں سے پیٹرول کس نے نکالا ہے؟“

”مجھے کیا پتا ہو.....“ ایوب اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں صرف ان گاڑیوں کی حفاظت کرتا ہوں جو گیٹ سے اندر ہوتی ہیں۔ ساری دنیا کی گاڑیوں کا میں نے ٹھیکہ نہیں لیا ہوا.....؟“

چوکیدار اگرچہ بڑے جارحانہ انداز میں بات کر رہا تھا مگر اس کے لہجے میں چھپے ہوئے چور کو کامران نے فوراً بھانپ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ پیٹرول کی چوری والے ناخوشگوار واقعے کی اسے خبر ہے مگر وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔ جواباً کامران کے انداز میں بھی ترشی اتر آئی۔
”میں دنیا جہان کی گاڑیوں کی بات نہیں کر رہا، صرف اپنی بائیک کا ذکر کر رہا ہوں۔“ وہ چوکیدار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ بائیک میں نے بلڈنگ کے اندر کھڑی کی تھی۔ اس وقت تم یہاں موجود نہیں تھے۔“

”اندر کھڑی کی تھی.....!“ وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آپ کو پہلے بھی منع کیا تھا گاڑی کو اندر لانے کے لیے.....“

”میں نے صدر صاحب سے اس کی اجازت لے لی تھی۔“ کامران نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”انہوں نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

ایوب بھی لخت ”آپ“ سے تم پر اترا آیا اور خاصی بدتمیزی سے بولا۔ ”صدر صاحب نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اگر میں دیکھ لیتا تو تمہیں بائیک کھڑی ہی نہ کرنے دیتا۔“

”میں ابھی صدر صاحب سے تمہارا سامنا کرتا ہوں۔“ کامران نے پھرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں سب سمجھ رہا ہوں تمہاری شیطانی کو۔ تم جانتے ہو، میری بائیک میں سے پیٹرول کس نے نکالا ہے۔ میں صدر صاحب سے تمہاری شکایت کروں گا۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔“ ایوب تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ ”جب صدر صاحب

دورے سے واپس آ جائیں گے تو تم شوق سے شکایت کر لینا۔ ابھی جاؤ یہاں سے..... میرا امتحانہ کھاؤ۔ خواخواہ جھگڑا ہو جائے گا۔“

کامران نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ”صدر صاحب کس قسم کے دورے پر گئے ہیں؟“

”وہ ہر تین ماہ کے بعد جماعت کے ساتھ جاتے ہیں۔“ چوکیدار نے بتایا۔ ”نیکی اور تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ ان کی واپسی پندرہ بیس دن کے بعد ہوگی۔“

کامران نے تھکی ہوئی سانس خارج کی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے، اشرف بھائی جب بھی واپس آئیں گے، ان سے تو میں بات کر ہی لوں گا، تم یہ بتاؤ..... میری بایک کا پیٹرول کس نے نکالا ہے۔ یہ بلڈنگ کے اندر کھڑی تھی اور..... اندر کھڑی گاڑیوں کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔“

چوکیدار نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”بلڈنگ کے اندر صرف ان لوگوں کی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں جو یہاں رہتے ہیں اور انہی کی حفاظت کامیں ذمہ دار بھی ہوں۔ مہمانوں اور غیر متعلقہ افراد کی گاڑیوں کامیں نے ٹھیک نہیں لے رکھا اور جہاں تک تمہاری بایک کے پیٹرول کی چوری کا تعلق ہے.....“ وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم اسی سے جا کر پوچھو جس نے تمہارا پیٹرول نکالا ہے۔ مجھ سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اشرف بھائی دورے سے واپس آ جائیں تو پہلے ان سے میری شکایت کر دینا.....!“

ایوب بظاہر سخت لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے کامران کو بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ دل ہی دل میں وہ اس کی کیفیت پر قہقہے لگا رہا ہے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہ کرائس اس کا پیدا کردہ تھا، چاہے یہ سب کچھ اس نے کسی اور کے اشارے پر کیا ہو..... یا کم از کم وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس کی بایک میں سے پیٹرول کس نے نکالا تھا۔

ان کے درمیان ہونے والی بحث نے دیکھتے ہی دیکھتے جھگڑے کا روپ دھار لیا۔ کامران بنیادی طور پر ٹھنڈے دماغ اور سلجھے ہوئے مزاج کا مالک تھا لیکن اس معاملے میں برداشت اور احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چوکیدار کی بدتمیزی کے جواب میں وہ بھی

زور زور سے چلانے لگا۔ ان کی آوازیں سن کر آس پاس کے لوگ بھی جائے وقوعہ پر جمع ہو گئے جن میں ریاض پیش پیش تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اسے اسی موقعے کا انتظار ہو!

ریاض کی آمد کے ساتھ ہی چوکیدار کا رویہ بدل گیا یعنی وہ پہلے سے بھی زیادہ غیر مہذب اور بدتمیز ہو گیا جس سے کامران کے شک نے حقیقت کا روپ دھار لیا کہ یہ ”واردات“ چوکیدار اور ریاض کی ملی بھگت سے ہوئی تھی جس میں چوکیدار نے ریاض کے آلہ کار کا کردار ادا کیا تھا جیسی وہ ریاض کی آمد پر شیر ہو گیا تھا۔

وہ زبانی جمع خرچ سے آگے بڑھ کر دست و گریباں ہو چکے تھے لہذا لوگ بیچ بچاؤ کے لیے کود پڑے۔ اس چھینا جھپٹی میں کامران کی شرٹ بھی پھٹ گئی۔ اس نے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے بڑے خطرناک انداز میں چوکیدار سے کہا تھا..... میں تمہیں دیکھ لوں گا! کامران کا یہ جملہ فطری اور صورت حال کے عین مطابق تھا مگر درجن بھر افراد کی موجودگی میں ادا کیا ہوا یہی جملہ اس کے لیے جان کا عذاب بن گیا۔ چند روز بعد چوکیدار ایوب اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا اور اس دھمکی دار جملے کی روشنی میں پولیس نے کامران کو گرفتار کر لیا تھا۔



مخصوص حالات میں انسان کی زبان سے نکلا ہوا کوئی جملہ اس کے لیے وبال جان بن جاتا ہے اور اگر اس جملے کو سننے والے گواہ بھی موجود ہوں تو پھر مصیبت آخری درجے کی نازل ہوتی ہے۔ میرے کلائٹ کامران علی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا تھا۔ لگتا تھا جیسے الفرید اپارٹمنٹس کے آس پاس کے لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہوں۔

مقتول چوکیدار ایوب کا تعلق بالا کوٹ سے تھا۔ وہ گزشتہ پندرہ سال سے کراچی میں تھا اور چوکیداری کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ الفرید اپارٹمنٹس میں کام کرتے ہوئے اسے لگ بھگ پانچ سال ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اکھڑ مزاج پایا تھا اور بلڈنگ کے کینوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ خاصا تند ہوتا تھا لیکن صدر صاحب یعنی اشرف بھائی کی مکمل حمایت اسے حاصل تھی اور وہ انہی کا لایا ہوا تھا۔ اشرف کے مطابق، کسی بھی رہائشی بلڈنگ کے لالہ (چوکیدار) کو اصولوں کا سخت ہونا چاہیے ورنہ آئے روز کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا رہے گا۔ اشرف بھائی مقتول کی تندی

اور اکھڑ پن کو اصول پرستی کے کھاتے میں ڈالتے تھے تاہم یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ جو بدتمیزی مقول نے ملزم کے ساتھ کی تھی، ایسا رویہ اس کا دیگر افراد کے ساتھ ہرگز نہیں تھا۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ چوکیدار نے کسی کے اکسانے پر ہی وہ قدم اٹھایا تھا۔

آئندہ پیشی میں ابھی چند روز باقی تھے لہذا میں ایک دن ایسے ہی گھومتے پھرتے اس علاقے کا سروے بھی کر آیا جہاں الفرید اپارٹمنٹس واقع تھا۔ اس وقت تک کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں اس کیس میں وکیل صفائی کی مسند سنبھال چکا ہوں لہذا مجھے اس گلی کے لوگوں سے ملنے اور انہیں کریدنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور میرے اس ”سروے“ نے موجودہ کیس کے بعض ایسے گوشے نمایاں کیے کہ میں دنگ رہ گیا۔ میں ایک عام سے آدمی کی حیثیت سے وہاں پہنچا تھا اور ظاہر یہی کیا تھا کہ مجھے کرائے پر کوئی فلیٹ چاہیے۔ عام طور پر بلڈنگز کے چوکیداروں کے علم میں ہوتا ہے کہ کس عمارت میں کون سا فلیٹ کرائے کے لیے خالی ہے۔ اس کا کرایہ اور ایڈوانس کیا ہے اور کون سا فلیٹ برائے فروخت ہے اور مالک کی ڈیمانڈ کیا ہے۔ اس سلسلے میں، میں ضمیر پلازا، گولڈن اسکوائر اور الفرید اپارٹمنٹس کے چوکیداروں سے بھی ملا۔ الفرید میں عمران نامی ایک نیا چوکیدار آ گیا تھا جسے حال ہی میں یونین کے سیکریٹری نے اپائنٹ کیا تھا۔ عمران کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ عمران کو عارضی طور پر رکھا گیا تھا تا کہ جب صدر صاحب تبلیغ اور چلہ کشی سے واپس آ جائیں تو باقاعدہ کسی تجربہ کار چوکیدار کا بندوبست کیا جائے۔ عمران، ضمیر پلازا کے چوکیدار کا کوئی عزیز تھا جو حال ہی میں گاؤں سے آیا تھا۔

مذکورہ بالا تینوں عمارتوں کے چوکیداروں کے علاوہ میں دیگر افراد سے بھی ملا اور چوکیدار ایوب، ریاض کے حالات و معاملات کے علاوہ اس علاقے کی سیاسی صورت حال بھی مجھ پر واضح ہو گئی۔ الفرید اپارٹمنٹس کے بلاک بی، فور تھ فلور پر رہنے والی ایک بیوہ عورت آنٹی زبیدہ نے مجھ سے بہت تعاون کیا۔ اس خاتون کی گزراوقات پراپرٹی کی ڈیلنگ پر تھی۔ وہ کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام کرتی تھی۔ میں معلومات کا بیش بہا خزانہ سمیٹ کر وہاں سے واپس آ گیا۔ سردست میں ان معلومات کے حوالے سے آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ عدالت کی کارروائی کے دوران مناسب مواقع پر خود بہ خود سب کچھ آپ کے سامنے آتا چلا جائے گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ذکر ہو جائے۔ اس رپورٹ کے

مطابق، مقتول ایوب کی موت پندرہ اکتوبر کی سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وہ حسب معمول سستانے کے لیے اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا کہ سائنسز لگے ریوالور سے دو فائر کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ دونوں گولیاں اس کے سینے میں اتر کر دل میں جا بیٹھیں تھیں جن کی ”بیٹھک“ کے سبب وہ فوری طور پر اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو گیا۔ مقتول کی لاش کے معائنے میں بھی ایسی کوئی علامت یا اشارہ نہیں ملا تھا کہ اس کی موت کے حوالے سے کوئی ابہام پیدا ہوتا۔ موت کا سبب بڑا واضح تھا۔

مقتول کی موت پندرہ اکتوبر کی سہ پہر کو واقع ہوئی اور ملزم، مقتول کے بچہ وہ جھگڑا بارہ اکتوبر کو ہوا تھا جس میں جھگڑے کے اختتام پر ملزم نے مقتول کو یہ کہا تھا کہ..... ”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“

واقعات کے مطابق، وقوع کے روز دو پہر کے بعد، ملزم کو اس گلی میں بھی دیکھا گیا تھا جہاں پرفیڈ اپارٹمنٹس واقع تھے۔ یہ ملزم کے حق میں اور بھی برا ہوا تھا کیونکہ چند روز قبل وہ درجن بھر افراد کے سامنے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر گیا تھا۔ وقوع کے روز وہ ضمیر پلازا میں ایک لیٹر دینے آیا تھا۔ اس پلازا میں ایک معروف کالج کے پروفیسر صاحب رہائش پذیر تھے۔ مذکورہ کالج اور پروفیسر صاحب کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ پولیس کو جائے وقوع پر سے آلہ قتل نہیں ملا تھا۔ ریماڈ کی مدت کے دوران انہوں نے ملزم کی زبان سے آلہ قتل کے بارے میں اگلوانے کی بھرپور کوشش کی تھی تاہم یہ کوشش بار آور ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ میرا موکل اس ریوالور کے حوالے سے ذرہ برابر معلومات بھی نہیں رکھتا تھا، پولیس والوں کو کیا بتاتا۔ پولیس والوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ ملزم نے مذکورہ ریوالور کو واردات کے بعد کسی گٹر وغیرہ میں یا کسی کچرا کنڈی میں پھینک دیا ہوگا۔

آئندہ پیشی سے پہلے میں نے زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے پوری تیاری کر لی تھی۔ ابھی تک عدالت میں یہ کیس جتنا بھی چلا تھا، اس میں کام کی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ سابق وکیل صفائی ملزم کی ضمانت کرانے میں بری طرح ناکام ہو گیا تھا اور عدالت نے ملزم کو جوڈیشل ریماڈ پر جیل بھجوا دیا تھا۔ میری، ملزم کے والد سے ملاقات کے وقت اسے جیل گئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ ملزم کے والد معظم علی نے پہلے وکیل کو فارغ کرنے کے بعد میری خدمات حاصل

کر لی تھیں۔ اب امید کی جاسکتی تھی کہ یہ کیس معقول انداز اور مناسب رفتار سے آگے بڑھے گا۔
میں اپنی تیاری سے پوری طرح مطمئن تھا۔



آئندہ پیشی پر جج نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اس کی متلاشی نظریں غالباً پہلے والے وکیل کو ڈھونڈنے لگیں۔ اس کا چونکنا عین فطری تھا کیونکہ عدالت کے کمرے میں بڑا واضح بدلاؤ نظر آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا وکالت نامہ دیگر ضروری کاغذات کے ساتھ جج کی خدمت میں پیش کر دیا۔

وکیل کی تبدیلی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ عدالتوں میں اس قسم کے واقعات اکثر و بیشتر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ چند لمحات تک کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو اس کیس کی پیروی اب آپ کریں گے بیک صاحب؟“
”ہاں سر!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس کے بعد جج کے حکم سے عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ ملزم کی ضمانت والے معاملات چند قدم پیچھے رہ گئے تھے۔ سابق وکیل صفائی کی پھپھسی کوشش نے یہ کام نہیں ہونے دیا تھا اور ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اب کارروائی یہاں سے آگے بڑھنا تھی۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی گواہ کٹہرے تک پہنچتا، میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔
میری یہ فرمائش فوراً پوری کر دی گئی۔

زیر سماعت کیس میں تفتیشی افسر شبر علی نام کا ایک سب انسپکٹر تھا۔ وہ جج کا حکم پا کر گواہوں والے کٹہرے میں آکھڑا ہوا۔ کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہتا ہے اور ایک طرح سے اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ جیسی ہوتی ہے۔

شیرعلی کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ سانولی رنگت اور درمیانے قد کا مالک ایک صحت مند شخص تھا جس نے اپنے چہرے پر داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ میں حج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا اور شیرعلی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آئی۔ اوصاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول ایوب کی موت، پندرہ اکتوبر کی سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب دی گئی؟“

”ہمارے روزنامے کے مطابق، یہ اطلاع تقریباً ساڑھے چار بجے دی گئی تھی۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”اور یہ اطلاع کس نے دی تھی؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اور کس کے ذریعے سے؟“

”اسی بلڈنگ کے ایک رہائشی عباسی صاحب نے فون کر کے ہمیں اس حادثے کی اطلاع دی تھی۔“ آئی او نے بتایا۔ ”عباسی صاحب کا پورا نام منیر عباسی ہے اور وہ فلیٹ نمبر اے۔ ٹو زیر و سکس کارہائشی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ ”آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”سب انسپکٹر شیرعلی نے بے دھڑک جواب دیا۔ ”پانچ بجے.....!“

”آپ نے جائے وقوعہ پر کیا دیکھا؟“ میں نے آئی او سے سوال کیا۔

”چونکہ ارا ایوب اپنے کمرے میں مردہ پڑا تھا۔“ اس نے جواب دیا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک چارپائی بچھنے کی گنجائش تھی یا پھر گزرنے کا راستہ تھا۔ جب میں مذکورہ کمرے میں پہنچا تو مقتول کو اپنے ہی خون میں لت پت پایا۔ وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ اس کی قمیص سینے پر سے خون میں تر بہہ رہی تھی۔ میں نے پہلی نگاہ میں اندازہ لگا لیا کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا ہے۔ میں نے موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے اسپتال بھجوا دیا۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ مقتول کو سائلنسر لگے ریوالور سے دو فائر کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کیا آپ نے جائے وقوعہ سے آلہ قتل حاصل کر لیا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ آئی او نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ہم جائے واردات پر سے آلہ قتل ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”جس سے آپ نے یہ فرض کر لیا کہ ملزم نے آلہ قتل کو کسی کچرا کنڈی یا کٹر میں پھینک دیا ہوگا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کی رپورٹ میں کچھ اسی قسم کے الفاظ درج ہیں؟“

”جی ہاں، اغلب امکان اسی بات کا ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”ملزم سات روز تک آپ کی کسٹڈی میں رہا تھا۔“ میں نے سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے چوٹ کی۔ ”عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کی تفتیش کے نتیجے میں تو پتھر دیکھ کر بھی زبان نکل آتی ہے۔ کیا آپ کے کسی آزمودہ فارمولے کے اثرات سے ملزم نے آلہ قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”پہلے تو میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ آپ نے جس عمومی تاثر کی بات کی ہے وہ سراسر غلط اور مبنی بر قیاس ہے۔“ تفتیشی افسر شبر علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ ہم ملزم کے منہ سے حقیقت اگلوانے کے لیے مختلف ہتھ کنڈے آزما رہے ہیں جو صرف ڈرانے دھمکانے تک محدود ہیں۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں کوئی صداقت نہیں!“

شبر علی کی آنکھیں اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ میں بے دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تو اس کا مطلب ہے، ریمائنڈ کی مدت کے دوران نہ تو ملزم نے اپنے جرم کا اقرار کیا اور نہ ہی آلہ قتل کے غیاب کے بارے میں کچھ بتایا؟“

”جی ہاں..... آپ کی بات درست ہے۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔

”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کی اس واردات سے میرے موکل کا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے؟“ میں نے چہیتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا جناب۔“ وہ چمک کر بولا۔ ”بعض مجرم بڑے ڈھیٹ اور سخت جان ہوتے ہیں، اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولتے، انہیں ٹرائل کے لیے کورٹ میں لانے کے بعد ہی کوئی بات بنتی ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ایسے شریف انفس افراد تو صرف دو تین فیصد ہی ہوتے ہیں جو تھانے میں حاضر ہوتے ہیں تو بڑی شرافت سے اپنے جرم کا اقبال کر لیتے ہیں.....!“

”تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ میرا موکل شریف انفس نہیں بلکہ سخت جان اور ڈھیٹ قسم کا انسان ہے۔ ریٹائرڈ کی مدت کے دوران میں اس نے آپ کی توقعات کی ایسی کم تہی کر دی اور اب تک ایک ہی بات پر ڈنڈا ہوا ہے کہ یہ جرم اس نے نہیں کیا..... چونکہ اریوب کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں۔“ میں نے سانس درست کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر تفتیشی افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک سمجھ رہا ہوں نا؟“

”آپ کا جوجی چاہے، سمجھتے رہیں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”ملازم کو عدالت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ استغاثہ کو مجرم ثابت کر کے دکھا دے گا۔ ابھی تو عدالتی کارروائی کی ابتدا ہوئی ہے.....“

”ابھی تو ابتدا ہوئی ہے..... آگے آگے دیکھیں گے، ہوتا ہے کیا۔“ میں نے اسی کے کہے ہوئے جملے پر گرہ لگائی اور قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”آئی او صاحب! آپ نے جائے وقوعہ سے ملازم کے فنگر پرنٹس اٹھائے تھے؟“

”نہیں.....!“ اس نے نکاسا جواب دیا۔

”کیوں؟“ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”کسی بھی وقوعہ پر سے ایف بی (فنگر پرنٹس) اٹھانا تو تفتیشی عمل کا لازمی جزو ہے۔ آپ نے کس خوش خیالی میں اسے نظر انداز کر دیا؟“

”بس.....!“ وہ بغلیں جھانکتے ہوئے ڈھٹائی سے بولا۔ ”ہم نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔“

”ماشاء اللہ..... سبحان اللہ.....؟“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ جھپٹے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا۔

”مطلب یہ ہے آئی او صاحب.....!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے

کہا۔ ”..... کہ آپ کو ملزم کے مجرم ہونے کا ایسا پکا یقین تھا یا یہ کہ ایسا یقین دلا دیا گیا تھا کہ آپ نے فنکٹر پرنٹس وغیرہ کے جھیلے میں پڑنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ہیں نا؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، ناپسندیدہ نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں ایک اہم پوائنٹ عدالت کے ریکارڈز پر لے آیا تھا لہذا میں نے جواب کے لیے اصرار بھی نہیں کیا اور بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آئی او صاحب! آپ نے ملزم کا مران علی کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟“
 ”دو قوع کی رات دس بجے کے قریب، اس کے گھر سے۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”گھر سے.....؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یعنی پی آئی بی کا لوئی سے؟“

”جی ہاں، میرے بتانے کا یہی مطلب ہے۔“
 ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ ملزم پی آئی بی کا لوئی میں رہتا ہے؟“
 ”اس کی کوریئر کمپنی ”فلاننگ ہارس“ کے دفتر سے ہم نے ملزم کے گھر کا ایڈریس لیا تھا۔“ آئی او نے بتایا۔ ”پھر ہمیں وہاں پہنچنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آئی۔“
 میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”ملزم کی کوریئر کمپنی کا نام آپ تک کیسے پہنچا تھا؟“

”موقع کے ایک گواہ نے اس بارے میں بتایا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”اس گواہ کا نام؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔
 ”ریاض..... ریاض احمد!“

”اوہ.....!“ میں نے حیرت زدہ ہونے کی اداکاری کی۔ ”یہ وہی ریاض احمد تو نہیں جس کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں بھی شامل ہے؟“
 ”جی..... جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اس بندے نے آپ کو اور کیا بتایا تھا؟“ میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔
 وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جس شخص کا ذکر کیا ہے وہ وقوعہ کے قریب واقع ایک رہائشی عمارت ضمیر پلازا میں رہتا ہے۔ ریاض اکثر و بیشتر ملزم کو اس گلی میں آتے جاتے

دیکھتا تھا۔ جب میں اطلاع ملنے پر جائے واردات پر پہنچا تو ریاض نامی یہ شخص الفریڈ اپارٹمنٹس کے اندر موجود تھا۔ موقع کی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے گواہوں کے بیانات قلم بند کرنا شروع کیے تو سب سے آگے یہی ریاض تھا..... وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ریاض نے مجھے بتایا کہ چند روز پہلے ملزم اور مقتول میں خطرناک نوعیت کا جھگڑا ہو چکا تھا جس میں ملزم کی شرٹ بھی پھٹ گئی تھی۔ لوگوں نے..... خصوصاً ریاض نے بچ بچاؤ کر کے انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا تھا ورنہ ملزم تو شاید اسی وقت مقتول کا کام کر دیتا۔ بہر حال، اس روز الفریڈ اپارٹمنٹس سے رخصت ہوتے ہوئے ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی پھر ٹھیک تین دن بعد یعنی پندرہ اکتوبر کو یہ افسوس ناک واقعہ پیش آ گیا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”صرف ایک ریاض ہی کی بات نہیں، کم از کم نصف درجن افراد نے اس واقعے کی تصدیق کی ہے۔ لہذا الاحالہ ہمارا دھیان ملزم کی طرف چلا گیا۔ ریاض نے ملزم کے کردار کے حوالے سے اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں لیکن چونکہ ان باتوں کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں بنتا اس لیے اس کا ذکر مناسب نہیں ہوگا۔“

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت محسوس نہیں ہوئی کہ آئی او، ریاض کے حوالے سے کن ”باتوں“ کا ذکر کر رہا تھا۔ یقیناً وہ معاملہ مسز شبانہ سے متعلق ہوگا۔ ریاض کو شک تھا کہ کامران اور شبانہ کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے جبکہ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ سب ریاض کے ذہن کا فتور تھا۔ وہ کم بخت شبانہ کے سلسلے میں ذہنی مریض ہو گیا تھا اور یہ نفسیاتی عارضہ اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ وہ ہر اس شخص کا دشمن ہو جاتا تھا جسے شبانہ سے نزدیک ہوتے دیکھتا تھا..... اور کامران اس دوڑ میں اسے پہلے نمبر پر نظر آتا تھا!

میں نے تفتیشی افسر کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کیا باتیں ہیں جن پر وہ مصلحت پر وہ ڈالے رکھنا چاہتا تھا۔ میں اگر ضرورت محسوس کرتا تو یہ تمام تر سوالات براہ راست ریاض سے کر سکتا تھا۔ وہ استغاثہ کا گواہ تھا اور جلد یا بدیر اسے وٹنس باکس میں آ کر تو کھڑے ہونا ہی تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر انکوائری آفیسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”آئی۔ اوہ صاحب! جائے وقوعہ پر موجود لوگوں کے بیانات..... خصوصاً ریاض کے بیان سے آپ کو واضح طور پر یہ اشارہ ملا کہ چوکیدار ایوب کا قتل فلائنگ ہارس نامی کوریئر کمپنی کے ایک نمائندے کامران علی نے کیا ہے لہذا آپ نے سوچا کہ فنگر پرنٹس والے بکھڑے پر مٹی ڈالو..... اور آپ فوراً کوریئر کمپنی کے دفتر پہنچ گئے۔“ میں نے چند لمحات کا وقفہ کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کمپنی کے دفتر سے، آپ کو ملزم کے گھر کا پتہ مل گیا اور آپ آنا فانا پی آئی بی کالونی جا پہنچے اور لگ بھگ رات دس بجے آپ نے ملزم کامران علی کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے تھے۔“

”شہر صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں استفسار کیا۔ ”گرفتاری کے فوراً بعد، کیا آپ نے ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کروایا تھا؟“

”یہ کیا ہوتا ہے جناب.....؟“ وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پیرافن (Paraffin) ٹیسٹ کی تفصیلات میں جاتے ہوئے اسے سمجھایا کہ اس ٹیسٹ کی مدد سے ملزم کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ جب کسی گن سے فائر کیا جاتا ہے تو گولی چلنے کے ساتھ ہی بارود کے نادیہ مخصوص ذرات اڑ کر فائر کرنے والے کے ہاتھوں پر آ گرتے ہیں اور جب تک ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر نہ دھویا جائے، یہ اپنی جگہ پر موجود رہتے ہیں۔ جب ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کیا جاتا ہے تو مذکورہ ذرات نمایاں ہو کر اپنی موجودگی کا اظہار کر دیتے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس شخص نے کسی گن سے فائر کیا تھا۔

پوری تفصیل سننے کے بعد آئی او نے کہا۔ ”اچھا..... آپ اس ٹیسٹ کی بات کر رہے ہیں۔ نہیں جناب، ہم نے یہ ٹیسٹ نہیں کروایا تھا۔“

شہر علی کی جگہ اگر کوئی کائیاں اور عیار انکوائری آفیسر ہوتا تو ہرگز ایسا جواب نہیں دیتا۔ وہ اپنی کم علمی یا لاعلمی کو کسی بھی صورت میں وکیل صفائی کے سامنے کھلنے نہ دیتا۔ میرے اندازے کے مطابق، اس کا جواب کچھ اس نوعیت کا ہوتا۔

”وقوعہ کو پیش آئے پانچ گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا اور اس دوران میں ملزم

نے اچھی طرح نہا دھو کر لباس بھی تبدیل کر لیا تھا لہذا اس ٹیسٹ کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے ہم نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا.....“

جبکہ آئی او شبر علی نے جو جواب دیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا وہ پیرافن ٹیسٹ کی کیمسٹری اور فزیالوجی سے قطعی ناواقف ہے۔ میں نے جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے کندھے اچکائے اور سادگی سے کہا۔

”جناب عالی! استغاثہ کی نظر میں یہ کیس اتنا سیدھا اور سادہ ہے کہ فنگر پرنش اٹھانے کی کوشش کی گئی نہ ہی پیرافن ٹیسٹ کو ضروری سمجھا گیا اور آلہ قتل کے تو دور دور تک آثار ہی نظر نہیں آتے۔“ میں نے لحاظی توقف کر کے ایک اطمینان بھری سانس لی اور حتمی لہجے میں کہا۔

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی.....!“

جج نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹس لیے اور سر اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چھ سات منٹ باقی تھے لہذا کسی اور گواہ کی پیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔



اگلی پیشی پر استغاثہ کی جانب سے منیر عباسی کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا۔ عباسی ایک پست قامت اور تیز و طرار شخص تھا۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا اور الفریڈ اپارٹمنٹس میں اس کی حیثیت کرائے دار کی تھی۔ وہ بنیادی طور پر اندرون سندھ کا رہنے والا تھا اور بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کراچی میں وہ اپنی سیکنڈ وائف کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی گاؤں میں، یعنی اپنے میکے میں رہتی تھی۔ دونوں بیویوں سے تین تین بچے تھے تاہم عباسی کا کہنا یہی تھا کہ اس کی ایک ہی بیوی ہے جو الفریڈ اپارٹمنٹس میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔ منیر عباسی نے جج بولنے کا حلف اٹھایا اور پھر اپنا بیان رکارڈ کرادیا۔ اصول کے مطابق، جج کی اجازت پا کر پہلے وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک گھما پھرا کر گواہ سے مختلف سوالات کرتا رہا جس کا لب لباب یہ تھا کہ بلڈنگ کا چوکیدار مقتول ایوب ایک سمجھ دار اور اصول پسند لالہ تھا۔ وہ کسی

کے ساتھ زیادتی کرتا تھا اور نہ ہی بدتمیزی۔ آؤٹ سائڈرز اور وزیٹرز کے ساتھ وہ نہایت ہی نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا..... مطلب یہ کہ اگر وقوعہ سے دو تین روز پہلے مقتول اور ملزم میں کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا تھا تو اس میں سراسر قصور وار ملزم ہی تھا۔

ملزم کے کردار کے حوالے سے بعض تیکھے سوالات کے جواب میں عباسی نے غیر تسلی بخش جوابات دیے۔ ریاض کی طرح عباسی کو بھی ملزم کا مسز شبانہ کے فلیٹ میں داخل ہونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میرے سروے میں ایک ”حقیقت“ یہ بھی سامنے آئی تھی کہ عباسی بھی مسز شبانہ پر ”نظر“ رکھتا تھا.....!“

اپنی باری پر، میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ منیر عباسی سے پوچھا۔ ”عباسی صاحب! کیا یہ صحیح ہے کہ وقوعہ کے روز آپ ہی نے فون کر کے پولیس کو اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

”جی ہاں، یہ بات درست ہے۔“ عباسی نے اثبات میں جواب دیا۔ ”یہ تو میرا فرض تھا جناب۔ بلڈنگ میں اتنا بڑا واقعہ ہو گیا تھا اور صدر صاحب بھی موجود نہیں تھے۔ مجھے جیسے ہی پتا چلا، میں نے فوراً فون کر کے متعلقہ تھانے میں اس واقعے کی اطلاع کر دی۔“

”میں یہ جاننا چاہوں گا عباسی صاحب.....!“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ چوکیدار کا قتل ہو گیا ہے؟“

”مجھے پڑوسی کے بچے نے بتایا تھا۔“ وہ جواب میں بولا۔ ”میرے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ یعنی۔“ اے۔ دو سو تین۔“ میں ایک ہندو فیملی رہتی ہے۔ ان کا ایک آٹھ سالہ بیٹا بھوش ہے۔ میں پانی کا دال کو کھولنے کے لیے دروازہ کھول کر باہر نکلتا تو وہ نیچے سے آ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا کہ انکل، بلڈنگ کے لالہ کو کسی نے اس کے کمرے میں قتل کر دیا ہے۔ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں دال کو کھول کر زینے سے اترتے ہوئے نیچے پہنچا اور چوکیدار کے کمرے کے پاس لوگوں کو جمع دیکھا۔ اگلے ہی لمحے صورت حال میری نگاہ کے سامنے عیاں ہو گئی۔ لالہ ایوب اپنی چار پائی پر بے جان پڑا تھا۔ سینے پر سے اس کا لباس خون میں سرخ ہو رہا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا..... اسے کس نے قتل کر دیا؟“

میرے عقب میں سے ایک آواز ابھر کر میری سماعت تک پہنچی۔ ”لگتا ہے، اس کو ریز والے نے اپنی دھمکی پر عمل کر دکھایا ہے!“

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا، وہ ریاض تھا جو ہمارے سامنے والی بلڈنگ ضمیر پلازا کا رہائشی ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح یہ بات میرے علم میں بھی تھی کہ دو تین روز پہلے ملزم اور مقتول میں شدید ترین جھگڑا ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں ملزم، مقتول کو سنگین نتائج کی دھمکی دے کر گیا تھا۔ میں نے چونک کر ریاض کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کیا وہ کم بخت کو ریز والا آج بھی کوئی لیٹر..... لے کر ”اے۔ تین سو چار“ میں گیا تھا؟“

”تین سو چار اور مسز شبانہ کا تو مجھے پتا نہیں۔“ ریاض نے لائق کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، البتہ میں نے تھوڑی دیر پہلے اس بندے کو الفریڈ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔“

”آپ کو اچھی طرح یاد ہے، یہ بات ریاض احمد ہی نے کہی تھی؟“ میں نے ضمیر عباسی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ریاض کے حوالے سے یہی بات انکوائری آفیسر نے بھی کہی تھی گویا ریاض اس امر کا چشم دید گواہ تھا کہ وقوع کے روز ملزم الفریڈ اپارٹمنٹس میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جواب طلب نظر سے کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ کی جانب دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے.....“

”عباسی صاحب! ذرا ذہن پر زور دے کر بتائیں.....“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جب آپ جائے وقوع پر پہنچے اور ریاض نے ملزم کی آمد اور بلڈنگ میں داخلے کے حوالے سے آپ کو اطلاع فراہم کی تو اس وقت کیا بجا تھا؟“

”اس وقت کم و بیش چار بج رہے تھے۔“ اس نے پراعتما دلچے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ چار بجے سے تھوڑی دیر پہلے کا مطلب پونے چار..... یا ساڑھے تین..... یا سوا تین ہی ہوتا ہے؟“

اس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں، میں اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاض صاحب نے جب ملزم کو الفریڈ اپارٹمنٹس میں داخل ہوتے دیکھا اس وقت سہ پہر کے لگ بھگ ساڑھے تین بج رہے تھے۔“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”ریاض صاحب کا نام استغاثہ کے معزز گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔ یہ سوال میں ان کی باری پر انہی سے پوچھوں گا کہ جب انہوں نے ملزم کو ساڑھے تین بجے الفریڈ اپارٹمنٹس میں داخل ہوتے دیکھا اس وقت وہ خود کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے بہر حال.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ عباسی صاحب!“

وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے تنکٹے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ میں نے کس بات کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے کچھ اور نہیں پوچھنا جناب عالی!“

منیر عباسی کے بعد الفریڈ اپارٹمنٹس کا صدر اشرف بھائی گواہی کے لیے پیش ہوا۔ وہ چند روز پہلے ہی تبلیغی دورے سے واپس آیا تھا۔ اشرف بھائی کا شمار معزز افراد میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی وضع قطع، حلیے اور کردار سے ایک نیک اور پرہیزگار انسان سمجھا جاتا تھا۔ اشرف بھائی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرایا۔ وقوعہ کے روز وہ چونکہ شہر میں موجود ہی نہیں تھا لہذا وہ اس واقعے پر زیادہ روشنی نہیں ڈال سکا تھا۔ اسے اس لیے کا بڑا دکھ تھا۔ اس کا بیان مقتول کے کردار، فرائض، ذمے داریوں اور اپارٹمنٹس کے قواعد و ضوابط تک محدود رہا تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی باری پر مختصر سی جرح کے بعد گواہ کو فارغ کر دیا تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے خوش اخلاقی سے استفسار کیا۔

”اشرف بھائی! آپ کیسے ہیں؟“

”اللہ کا شکر اور احسان ہے۔“ وہ کمراری آواز میں بولا۔

”تبلیغ کا سلسلہ کیسا چل رہا ہے؟“ میں ایک سوال آگے بڑھ آیا۔

”اللہ چلانے والا ہے بھائی۔ انسان تو صرف کوشش ہی کر سکتا ہے۔ برکت اور کامیابی

دینا تو صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔“

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”اشرف بھائی جب یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا، آپ نیکی کے مشن پر تھے لہذا میں آپ سے وقوعہ کے روز کے حوالے سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ ہم وقوعہ سے دو تین دن پیش تر مقتول اور ملزم کے مابین ہونے والے جھگڑے کا بھی تذکرہ نہیں کریں گے۔ اس سے مزید چند روز پیچھے جاتے ہیں جب آپ کراچی میں موجود تھے۔ ٹھیک ہے.....؟“

”بالکل ٹھیک جناب۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ فرمائیں۔ میں پوری توجہ سے آپ کی بات سن رہا ہوں۔“

بقول اشرف بھائی، میں نے فرمایا۔ ”صدر صاحب! تبلیغی دُورے پر روانہ ہونے سے چند روز قبل آپ اپنی بلڈنگ کی پانی والی ایک موٹر ٹھیک کر وارہے تھے۔ وہ دن آپ کے حافظے میں ہے؟“

”جی ہاں..... وہ دن پوری طرح میرے حافظے میں محفوظ ہے۔“

”آپ نے بلڈنگ کے چوکیدار مقتول ایوب کو موٹر کا کوئی سامان لانے کے لیے ہارڈویئر کی دکان پر بھیجا ہوا تھا اور اسی دوران میں ملزم آپ سے ایک چھوٹی سی عرض کرنے آیا تھا؟“ میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی مجھے یاد ہے۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس بے چارے کی بائیک کے ساتھ گلی کے شیطان بچے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور یہ مجھ سے اس بات کی اجازت لینے آیا تھا کہ میں اسے بائیک کو بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑا کرنے دوں۔“

”تو آپ نے ملزم کو بائیک اندر کھڑی کرنے کی اجازت دے دی تھی؟“

”اس میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آئی لہذا میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔“

صدر صاحب نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ”اس کی بات اور ضرورت میری نظر میں بالکل جائز تھی کیونکہ..... اللہ معاف کرے، آج کل دیکھنے میں یہی آ رہا ہے کہ اگر کسی بچے کو شیطانی، بے ہودگی اور بدتمیزی سے منع کیا جائے تو اس کے والدین سخت ناراض ہو جاتے ہیں۔ پتا نہیں.....“

اس نے ایک مرتبہ پھر کمرے کی چھت کو دیکھا اور جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ہم لوگ کدھر جا رہے ہیں.....!“

”اشرف بھائی!“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے تو ملزم کو بلڈنگ میں بائیک کھڑی کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اس سے ملزم کی تسلی نہیں ہو سکی تھی اور اس نے آپ سے مزید درخواست کی تھی کہ آپ اس ”اجازت“ کے حوالے سے چوکیدار کو بھی بتا دیں جو کہ اس وقت موقع پر موجود نہیں تھا۔ کیا آپ نے مقتول ایوب کے آنے پر اسے ملزم کی بائیک کے حوالے سے ہدایات دے دی تھیں؟“

”جی ہاں۔“ اشرف بھائی نے پورے وثوق سے کہا۔ ”میں نے چوکیدار کو اس بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔“

”آپ نے تو اپنا فرض پورا کیا اور اللہ کے احکام کی پیروی کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن آپ کی غیر موجودگی میں مقتول نے آپ کی ہدایات پر مطلق عمل نہیں کیا.....“ میں لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے جس کام میں کوئی قباحت نہیں سمجھی تھی وہ مقتول کو انتہائی ناجائز نظر آیا اور اس نے آپ کی ہدایات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ملزم سے اس بات پر شدید جھگڑا کیا کہ وہ اپنی بائیک بلڈنگ کے اندر کیوں لے کر آیا ہے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں چھڑایا تھا ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ بارہ اکتوبر کا واقعہ ہے اور پندرہ اکتوبر کو چوکیدار ایوب کا قتل ہو جاتا ہے.....“

”جی، مجھے لوگوں نے بارہ اکتوبر والے جھگڑے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔“ اشرف بھائی نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”اور مجھے یہ سن کر حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا تھا کہ ایوب نے میری ہدایت کے خلاف کیوں عمل کیا..... اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا!“

”یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے اشرف بھائی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر ایوب کی موت واقع نہ ہوئی ہوتی تو آپ آج اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھ سکتے تھے کہ اس نے آپ کی حکم عدولی کیوں کی۔ وہ کس کی باتوں میں آ گیا تھا، کس کی شہ پر اس نے ملزم کے ساتھ لڑائی جھگڑا کیا مگر.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”مگر چوکیدار ایوب کو زندہ کرنا ممکن نہیں اس لیے یہ تمام تر سوالات میں کسی اور سے

پوچھوں گا..... جب وہ گواہی دینے کٹہرے تک پہنچے گا.....“ پھر میں نے جج کی طرف رخ پھیرتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

”دیش آل پورا آز.....!“

اس کے بعد عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔



آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے دو گواہ پیش ہوئے۔ ان دونوں کا تعلق اسی گلی سے تھا جہاں یہ قتل کی واردات ہوئی تھی۔ ایک کا نام نعمت اللہ تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھا اور دوسرا کباب بیچنے والا اسہیل احمد تھا۔ ان دونوں کے بیانات میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی لہذا سرسری سے جائزے کے بعد میں آگے بڑھتا ہوں۔ مذکورہ دونوں گواہ اس واقعے کے عینی شاہد تھے جب بارہ اکتوبر کو مقتول اور ملزم کے مابین ایک زبردست قسم کا جھگڑا ہوا تھا۔ وہ انہیں چھڑانے میں بھی پیش پیش رہے تھے اور جب ملزم کا مران علی پھٹی ہوئی شرٹ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو انہوں نے اسے خطرناک انداز میں یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا..... میں تمہیں دیکھ لوں گا! میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ استغاثہ کی عمارت کی بنیاد صرف اسی نکتے پر استناد تھی کہ وقوعہ سے دو تین دن پہلے یعنی بارہ اکتوبر کو ملزم نے بڑے کھلے الفاظ میں مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔ بہر حال، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں.....!

جج نے اس روز پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت درخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ ازیڈ جارنڈ.....!“

آئندہ پیشی سے پہلے ملزم کا والد، ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر معظم علی مجھ سے ملنے میرے دفتر آیا۔ اس دوران بھی ہماوی دو تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور وہ میری کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ میں نے مختلف نوعیت کی مفید معلومات جمع کرنے میں اس سے بھی مدد لی تھی خصوصاً ملزم کی مصروفیات کے حوالے سے بڑے اہم نکات حاصل ہوئے تھے جن کی بنیاد پر میں کیس کا پاپا پلٹ سکتا تھا اسی لیے میں بڑا پرسکون تھا اور استغاثہ کے گواہوں کے ساتھ دل لگی کے انداز میں جرح کر رہا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد معظم علی نے مجھ سے کہا۔ ”بیک صاحب! آپ دھیرے دھیرے کیس کو اس کے منطقی انجام تک لے آئے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے، ایک دو پیشیوں میں اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں معظم صاحب!“ میں نے پر وثوق انداز میں کہا۔ ”انشاء اللہ! آئندہ پیشی پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

اس کیس سے متعلق ہم تھوڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے پھر وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔



منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ریاض احمد کھڑا تھا۔ اہم اس حوالے سے کہ اس کیس کے مختلف پہلوؤں میں اس کی ٹانگ پھنسی ہوئی تھی۔ ریاض نے اپنا حلیہ بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کافی دیر تک نئے نئے زاویے سے گھما پھرا کر گواہ سے سوالات کرتا رہا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مقتول اور ملزم کے جھگڑے کا سبب ملزم کی ہٹ دھرمی اور مقتول کی اصول پسندی تھی۔ وغیرہ وغیرہ..... اس جرح کی تان ایک ہی مقام پر آ کر ٹوٹی تھی کہ..... وقوعہ سے چند روز قبل ملزم نے مقتول کو بڑی خوفناک دھمکی دی تھی۔

میں اپنی باری پر جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور اپنے ”کام“ کا آغاز کرتے ہوئے میں نے استغاثہ کے سب سے زیادہ ”معزز“ گواہ سے سوال کیا۔

”ریاض صاحب! آپ ضمیر پلازا کے رہائشی ہیں۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

”جی ہاں.....“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”آپ جس فلیٹ میں رہتے ہیں وہ آپ کی ملکیت ہے یا آپ کرائے دار کی حیثیت سے وہاں رہائش پذیر ہیں؟“

خلاف معمول جرح نے گواہ کو تھوڑا مضطرب تو کیا تاہم اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اس فلیٹ میں ایک طویل عرصے سے رہ رہا ہوں اور یہ میرا اپنا ہے۔“

”ویری گڈ.....!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”پھر تو آپ ضمیر پلازا کے تمام
 مکنوں کو اچھی طرح جانتے ہوں گے؟“

”جی ہاں، ایک ایک کو جانتا ہوں۔“

”ضمیر پلازا کے بلاک بی میں ایک پروفیسر صاحب رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس
 فیملی کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے..... مطلب وہ کیسے لوگ ہیں؟“

”آئیچیکشن یور آئر۔“ وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”میرے فاضل دوست
 غیر متعلقہ باتوں میں الجھا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔“

”اول تو پروفیسر صاحب کا معاملہ غیر متعلق نہیں ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں
 وکیل استغاثہ کے اعتراض کا جواب دیا۔ ”اور اگر گواہ کو میرے سوال پر کوئی پریشانی ہے تو وہ بیان کر
 سکتا ہے۔“

”مجھے کوئی پریشانی نہیں۔“ ریاض احمد نے حد سے زیادہ اسماٹ بنتے ہوئے جلدی
 سے کہا۔

وکیل استغاثہ کو اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی تاہم زبان سے کچھ کہنے کے بجائے وہ محض
 اسے گھور کر رہ گیا۔ میں وکیل استغاثہ کو نظر انداز کرتے ہوئے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ریاض نے
 میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

”پروفیسر صاحب اور ان کی فیملی نہایت ہی نفیس اور قابل اعتبار لوگ ہیں۔ پروفیسر
 صاحب کا اکلوتا بیٹا میڈیکل کال اسٹوڈنٹ ہے۔ ایک آدھ سال میں وہ ڈاکٹر بن جائے گا۔“

”بہت بہت شکریہ ریاض صاحب.....!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

میرے اس دھیمے انداز پر وکیل استغاثہ کو گویا مرچیں سی لگ گئیں، نہایت ہی طنزیہ لہجے
 میں اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

”میرے فاضل دوست! کیا آپ معزز عدالت کو یہ بھی بتا دیں گے کہ پروفیسر صاحب
 کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟“

”ضرور بتاؤں گا جناب!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب
 موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”جناب عالی! پروفیسر صاحب کی اہلیہ دراصل ایک زاویے سے صفائی

کے گواہ کی حیثیت کی حامل ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ان خاتون کو عدالت تک لاؤں گا اور پکے کاغذی ثبوت کے ساتھ.....!“

جج نے معنی خیز انداز میں سرکواثباتی جنبش دی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”بیک صاحب! پلیز پروسیڈ۔“

وکیل استغاثہ اور استغاثہ کے اہم گواہ ریاض احمد کے چہروں پر مجھے الجھن نما حیرانی کے آثار نظر آئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ میں پروفیسر کی بیوی سے کس قسم کی گواہی دلوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے ان کی ذہنی کیفیت کی پروا کیے بغیر اپنا ”کام“ آگے بڑھاتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ ”ریاض صاحب! آپ کی ایک بیوی اور دو بچے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟“

”میں اسٹیٹ کا کام کرتا ہوں۔“

”مطلب، ریل اسٹیٹ کا.....؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی ہاں.....“ اس نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ ”نوٹو اسٹیٹ نہیں۔“

”کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی اسٹیٹ ایجنسی کہاں پر واقع ہے؟“ میں نے چپھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کیونکہ میری معلومات اور گلی والوں کے مطابق تو آپ ہر وقت ضمیر پلازا کے آس پاس ہی دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی گلی میں ٹہکتے ہوئے، کبھی ضمیر پلازا کے گیٹ کے باہر، ٹیلی فون کے پول سے پشت ٹکائے اور کبھی ضمیر پلازا کی چھت پر مڑگشت کرتے ہوئے.....!“

میں نے فکر انگیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری باقاعدہ کوئی اسٹیٹ ایجنسی نہیں ہے بلکہ مختلف پراپرٹی ایجنٹوں سے میرے رابطے ہیں۔ میں چلتے پھرتے ان کے لیے کام کرتا رہتا ہوں۔ وہ فی پارٹی طے شدہ کمیشن مجھے دے دیتے ہیں۔“ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو میرے گھومنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور چہلنے پر کیا اعتراض ہے وکیل صاحب؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”البتہ، جس شخصیت کو اعتراض ہے، وہ اعتراض کا اظہار کر کے خود کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتی۔“

”آپ کا اشارہ کس کی جانب ہے؟“ وہ محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”اشارہ آپ سمجھ گئے ہیں، یہی کافی ہے۔ طرف اور جانب کے چکر میں نہ پڑیں۔“
 میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ آپ بے چین ہو کر ادھر ادھر نہ دیکھتے۔ آپ کے ذہن میں چور چھپا ہوا ہے جیسی فوراً گھبرا گئے تھے کہ کہیں وہ شخصیت آپ کی شکایت لے کر عدالت میں تو نہیں آگئی..... ہیں نا؟“

”میں بالکل گھبرایا ہوا نہیں ہوں۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ”میں پریشان کیوں ہوں گا۔ جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو پھر مجھے کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پتا نہیں، آپ کس شخصیت کی بات کر رہے ہیں.....!“

”یہ بھی اچھا ہی ہے کہ آپ کو اس شخصیت کا پتا نہیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔
 ”اگر پتا چل گیا تو ایسی مصیبت میں پھنسیں گے کہ جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی، خیر.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر دوبارہ جرح کی پٹری پر آتے ہوئے کہا۔

”ریاض صاحب! پولیس کی رورپٹ کے مطابق، وقوعہ کے روز آپ نے تفتیشی افسر کے سامنے یہ انکشاف کیا تھا کہ آپ نے فلائنگ ہارس کوریئر کے نمائندے کا مران علی کو وقوعہ سے تھوڑی دیر پہلے الفریدا پارٹمنٹس میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟“
 ”جی ہاں..... یہ سچ ہے۔“

”پھر میرعباسی کو بھی آپ ہی کی زبان سے پتا چلا کہ ملزم الفریدا پارٹمنٹس میں آیا تھا۔“
 میں نے تصدیقی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اور یہاں بھی آپ نے ”تھوڑی دیر پہلے“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ہیں نا.....؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”اس ”تھوڑی دیر“ کی وضاحت بھی کر دیں؟“
 ”میرا مطلب ہے..... تین، سو ا تین بجے۔“ وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ”یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین بجے۔“

”اس وقت آپ کہاں کھڑے تھے جب ملزم الفرید اپارٹمنٹس میں داخل ہوا تھا؟“
 ”میں اپنے پلازہ کے باہر، ٹیلی فون کے کھمبے کے پاس کھڑا تھا۔“
 ”ملزم نے الفرید اپارٹمنٹس میں کتنا وقت لگایا تھا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیا وہ آپ کی نظروں کے سامنے وہاں سے روانہ ہوا تھا؟“

”جی ہاں، وہ میرے سامنے ہی روانہ ہوا تھا اور خاصی افراتفری میں نظر آتا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ورنہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اسی لیے..... مجھے اس کے انداز پر حیرت ہوئی تھی۔“
 ”پہلے کیسا نہیں ہوا تھا؟“ میں نے کرید کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی ریاض صاحب.....!“

”میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پہلے وہ جب بھی الفرید اپارٹمنٹس کی ڈاک لے کر آتا تھا تو پندرہ بیس منٹ اندر گزارنے کے بعد ہی رخصت ہوا کرتا تھا اور جاتے وقت اس کے چہرے پر سکون اور آسودگی کے تاثرات ہوتے تھے لیکن اس روز تو اس کی حالت ہی عجیب تھی۔ لگتا تھا، لگتا تھا.....“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔ ”کیا لگتا تھا؟“
 ”یہی لگتا تھا کہ اس روز مسز شبانہ کے لیے اس کے پاس کوئی لیٹر نہیں تھا۔“ ریاض نے کڑوا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ”الفرید اپارٹمنٹس میں زیادہ تر مسز شبانہ ہی کے لیٹر کوریئر سے آتے ہیں۔ وہ نہ صرف لیٹر وصول کرتی تھی بلکہ کوریئر والے کو گھر کے اندر بلا کر چائے پانی بھی پوچھا کرتی تھی۔ ملزم اس کے فلیٹ میں پندرہ بیس منٹ گزارے بغیر نیچے نہیں اترتا تھا۔“

”اور آپ یہ سارے مناظر کبھی اپنے کچن کی کھڑکی میں سے اور کبھی بلڈنگ کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا کرتے تھے۔ جس سے آپ کو جلن ہوتی تھی کیونکہ آپ خود مسز شبانہ کو حریصانہ نظروں سے دیکھا کرتے تھے.....“ میں نے اسے تنکیسی نظروں سے گھورا۔ ”فلیٹ سسٹم میں یہ خرابی بہر حال موجود رہتی ہے کہ ایک گھر سے دوسرے کے گھر میں ناکا جھانکی خاصی سہل ہو جاتی ہے۔ مسز شبانہ کے فلیٹ کے کمروں کی دو کھڑکیاں ضمیر پلازا کی سمت کھلتی ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟“

میں نے اس کی دکھتی رجگ کو چھیڑا تو وہ بے چین ہو گیا پھر بات کو بدلتے ہوئے جلدی

سے بولا۔ ”اس روز ملزم الفرید پارٹمنٹس سے جاتے ہوئے خاصا جلدی میں اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت خطرناک کام کر آیا ہو اور اسے جانے وقوعہ سے دور نکلنے کی خواہش ہو۔“

وہ واضح طور پر مسز شبانہ کے ذکر سے کئی کاٹ گیا تھا۔ میں خود بھی اس خاتون کو عدالتی کارروائی میں نہیں گھسیٹنا چاہتا تھا لہذا دوبارہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے گواہ سے کہا۔

”ریاض صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے بتانا چلوں کہ میں نے وقوعہ کے روز یعنی پندرہ اکتوبر کے حوالے سے فلائنگ ہارس کوریٹر کمپنی کا ریکارڈ چیک کیا ہے۔ اس سلسلے میں کمپنی کے ایک اعلیٰ عہدے دار منصور صدیقی نے مجھ سے بہت تعاون کیا ہے۔ امید ہے، آپ بھی اس حوالے سے تعاون کرو گے؟“

”کیسا تعاون.....؟“ وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”منصور صدیقی نے کیا تعاون کیا ہے؟“

میں نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ اس کے چاروں طرف ایک ایسا نا دیدہ جال پھیلا رہا تھا جو بلا خراسے اپنی جگہ میں لے کر بچ بولنے پر مجبور کر دیتا۔ میں یہی چاہتا تھا، وہ بچ بولے اور بچ کے سوا کچھ نہ بولے کیونکہ عدالت کے رو بہ رویاں دیتے ہوئے اس نے اسی قسم کا حلف اٹھایا تھا۔ میں نے نہایت ہی مستحکم لہجے میں کہا۔

”فلائنگ ہارس کوریٹر کمپنی کا آفس حیدری کے علاقے میں واقع ہے۔ میں وہاں جا کر منصور صدیقی سے مل چکا ہوں انہوں نے مجھے پندرہ اکتوبر کی اس ڈاک کا ریکارڈ دکھایا ہے جو ملزم کے ہاتھوں تقسیم ہوئی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ وقوعہ کے روز ملزم نے اس گلی میں صرف ایک لیٹر پہنچایا تھا اور وہ بھی ضمیر پلازاکے رہائشی پروفیسر صاحب کے گھر.....“

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ چونکہ خود بھی ضمیر پلازا ہی میں رہائش پذیر ہیں اور پروفیسر صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے ذرا سوچ کر بتائیں کہ ملزم ضمیر پلازا سے نکلنے کے بعد الفرید کی طرف گیا تھا یا الفرید سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ضمیر پلازا کا رخ کیا تھا کیونکہ..... آپ تو اس وقت ضمیر پلازا کے گیٹ کے پاس ہی کھڑے ہوئے تھے۔ یہ معاملہ آپ کی نظروں سے پوشیدہ تو نہیں رہا ہوگا؟“

دکیل استغاثہ سوچتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔ اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ میں گواہ کو بانس پر چڑھا کر سیڑھی کھینچنے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہوں لیکن وہ اپنے گواہ کو جواب دینے سے نہیں روک سکتا تھا لہذا بے بسی سے تمللا کر رہ گیا۔

ریاض احمد بھی جواب دینے سے پہلے لمحے بھر کے لیے شش و پنج میں پڑ گیا تھا کیونکہ وہ اپنے دکیل کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ چکا تھا تاہم وہ جلد ہی سنبھل گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مجھے اچھی طرح یاد ہے جناب..... ملزم پہلے تو ضمیر پلازا میں گیا تھا مگر وہاں سے یہ جلد ہی نکل آیا تھا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ الفرید اپارٹمنٹس میں گھس گیا تھا۔ میں امید کر رہا تھا کہ اب تو میں پچیس منٹ گئے لیکن یہ دو تین منٹ ہی میں باہر نکل آیا اور اپنی بایک پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا.....“

”اور اس وقت سہ پہر کے تین، سوا تین یا ساڑھے تین بجے تھے؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”جی..... جی ہاں!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔“

”یہ محض میں نے تصدیق کی خاطر پوچھا ہے کیونکہ اس کے بعد آنے والے سوال کا ٹائم کی حقیقت سے براگہر تعلق ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”سمجھنے اور نہ سمجھنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہو گا دکیل صاحب جب آپ مجھے وہ بات بتائیں گے جو ابھی تک آپ کے ذہن میں ہے!“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے، میں اپنے ذہن کی بات زبان پر لاتا ہوں۔“ میں نے اپنے منصوبے کو فائل ٹچ لگاتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا، پھر استغاثہ کے گواہ ریاض احمد سے پوچھا۔

”کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ جب کوئی کوریئر والا کسی لینر کو اس منزل پر پہنچاتا ہے تو لینر دینے سے پہلے وہ متعلقہ شخص سے ایک مخصوص واچر پر دستخط بھی لیتا ہے؟“

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ یہ تو عام سی بات ہے۔“

”اسی واؤچر پر تاریخ اور وقت کے اندراج کے خانے بھی بنے ہوتے ہیں۔“ میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”تا کہ اس ریکارڈ کو محفوظ کیا جاسکے کہ کون سا خط کس شخص نے کس تاریخ کو کتنے بجے وصول کیا تھا۔ اگر اصل آدمی گھر پر موجود نہ ہو تو احتیاط کے تقاضے کو پیش نظر رکھتے ہوئے لیٹر وصول کرنے والے کا نام اور اصل شخص سے رشتہ بھی درج کر لیا جاتا ہے۔“

”مجھے اتنی باریکیوں اور پیچیدگیوں کا پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا۔“ وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آج تک کوریئرسروس سے میرا کوئی لیٹر نہیں آیا۔“

”مجھے یہ سن کر حیرت نہیں، بلکہ خوشی ہو رہی ہے!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”آنجیکشن یور آؤ!“ وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے بہ آواز بلند نعرہ لگایا۔ ”ڈیفنس کونسلر، استغاثہ کے معزز گواہ کے ساتھ بڑی زیادتی کر رہے ہیں.....!“

”کس قسم کی زیادتی؟“ میں نے براہ راست وکیل مخالف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

”اگر میرے معزز گواہ کو کوریئر کمپنی والوں کی باریکیوں کا پتا نہیں تو اس میں آپ کے لیے خوشی کی کیا بات ہے؟“ وہ بھی جوش میں آ گیا۔

”میرے لیے خوشی اور مسرت کی بات یہ ہے کہ گواہ کی لاعلمی نے میرے موکل کی بے گناہی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔“ میں نے بھی جواباً جوشیلے لہجے میں کہا۔ ”لاعلمی کو کچھ لوگ زحمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کیس میں استغاثہ کے گواہ کی لاعلمی، ملزم کے لیے رحمت ثابت ہونے والی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔ ”وہ ایسے کہ.....“ پھر میں جج کی طرف مڑا اور اپنے موکل کی حمایت میں کہنا شروع کیا۔

”جناب عالی! وقوعہ کے روز جب ملزم پروفیسر صاحب کے لیے ایک لیٹر لے کر ضمیر پلازا پہنچا تو وہ دوپہر کا وقت تھا اور اس وقت پروفیسر صاحب گھر پر موجود نہیں تھے لہذا ان کی اہلیہ نے سائن کر کے وہ لیٹر وصول کر لیا۔ اس لیٹر کی رسید یعنی کوریئر کے مخصوص واؤچر پر پندرہ اکتوبر کی تاریخ

اور وقت دوپہر ایک بج کر پچاس منٹ درج ہے۔ میری، پروفیسر صاحب سے اور ان کی اہلیہ سے بات ہو چکی ہے۔ رسید ان کے پاس محفوظ ہے اور مسز پروفیسر نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ کوریئر والا درج شدہ وقت پر ہی ان کے گھر پہنچا تھا۔ علاوہ ازیں، بالکل ایسا ہی ریکارڈ ”فلائنگ ہارس“ کوریئر کمپنی کے آفس میں بھی موجود ہے۔ ضرورت پڑنے پر مسز پروفیسر اور کوریئر کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار منصور صدیقی کو میں اس امر کی گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر سکتا ہوں.....“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمبائی توقف کیا پھر سلسلہ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

”یور آنر! استغاثہ کے گواہ مسٹر ریاض احمد نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو رہتا ہے کہ وقوعہ کے روز وہ ضمیر پلازا کے گیٹ کے قریب کھڑا تھا تو اس نے لگ بھگ تین، سواتین، ساڑھے تین بجے ملزم کو پہلے ضمیر پلازا میں اور اس کے بعد الفرید اپارٹمنٹس میں داخل ہوتے دیکھا پھر وہ دو تین منٹ بعد ہی اپنی بائیک پر سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اب اگر.....“ میں نے ایک مرتبہ پھر توقف کر کے باری باری وکیل استغاثہ، استغاثہ کے گواہ، انکوائری آفیسر اور حاضرین عدالت کو دیکھا پھر دوبارہ جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! اب اگر ہم استغاثہ کے گواہ کو سچا مان لیتے ہیں تو کوریئر کمپنی کا ریکارڈ، تمام رسیدیں اور واؤچرز، پروفیسر اور ان کی اہلیہ کو بھی جھٹلانا پڑے گا اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ ہم کس کے سامنے کس کو جھٹلا رہے ہیں۔ کسی ایک شخص کے مقابلے میں نصف درجن معزز افراد غلط نہیں ہو سکتے..... اور اگر وہ سب غلط نہیں ہیں تو پھر استغاثہ کے گواہ کی دروغ گوئی میں کوئی کلام نہیں رہ جاتا.....“ میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! یہ ایک مسلمہ اصول ہے اور دنیا کے ہر شخص پر لاگو ہوتا ہے کہ..... کوئی بھی انسان اس وقت دروغ گوئی کا سہارا لیتا ہے جب وہ کوئی جرم کرنے جا رہا ہوتا ہے یا پھر اپنے کیے ہوئے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ ہمیشہ کسی بڑے فائدے کو حاصل کرنے کے لیے یا کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے جھوٹ کا استعمال کیا جاتا ہے.....“

جج نے میرے خاموش ہونے پر گھور کر کٹھنرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ ریاض احمد کو

دیکھا لیکن زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔ ریاض نے حج کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے گردن جھکالی۔ پتا نہیں، وہ جھکی ہوئی گردن کے ساتھ اپنے کون سے جرم کا اقرار کر رہا تھا.....!

میں دوبارہ حج کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”بیک صاحب! کیا آپ آئندہ پیشی پر کوریئر کمپنی کا وہ واؤچر عدالت میں پیش کر سکتے ہیں جو لیٹر پروفیسر صاحب کی اہلیہ نے وصول کیا تھا۔ اگر ضرورت پڑی تو بعد میں مسز پروفیسر اور منصور صدیقی صاحب کو بھی عدالت میں طلب کر لیا جائے گا۔“

”بالکل جناب..... میں مذکورہ واؤچر عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔ وہ دراصل میرے ہی پاس محفوظ رکھا ہے۔ میں نے مسز پروفیسر سے درخواست کر کے وہ کاغذ کا ٹکڑا حاصل کر لیا تھا لیکن.....“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس متعلقہ واؤچر کے علاوہ سلمان علی اور زبیدہ آنٹی کو بھی اگلی پیشی پر، یہاں آنے کی زحمت دینا چاہتا ہوں۔“

حج نے ابھمن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ سلمان علی اور زبیدہ آنٹی کون لوگ ہیں؟“

میں نے بتایا۔ ”سلمان علی، ملزم کا مران علی کا ایک گہرا دوست ہے جو حیدری مارکیٹ میں واقع کسی بینک میں کام کرتا ہے۔ وقوعہ کے روز وہ ملزم سے ملنے لگ بھگ ساڑھے تین بجے کوریئر کمپنی کے آفس پہنچا تھا۔ وہ دونوں باہر جا کر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے۔ انہوں نے ایک ساتھ لंच کیا پھر کم دیش ساڑھے چار بجے ملزم اپنے دوست سے رخصت ہو کر گھر چلا گیا تھا۔ ملزم کے دفتر کے لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ وقوعہ کے روز ساڑھے تین بجے سلمان، ملزم سے ملنے اس کے آفس آیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ سلمان کے آنے سے پہلے ملزم کوئی گھنٹے بھر سے آفس میں موجود تھا یعنی وہ اپنی ڈیوٹی منہا کر ڈھائی، پونے تین بجے واپس آفس آچکا تھا۔ سلمان علی اس امر کی گواہی دے گا کہ وقوعہ کے روز ملزم سارے تین سے ساڑھے چار بجے تک اس کے ساتھ حیدری کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا۔“

”اور زبیدہ آنٹی کا اس کیس میں کیا کردار ہے؟“ حج کے سوال میں حیرت بھری ہوئی

تھی۔

میں نے جواب میں بتایا۔ ”زبیدہ آنٹی ایک بے آسرا اور بیوہ عورت ہے۔ وہ الفرید اپارٹمنٹس کے بلاک۔ بی میں رہتی ہے۔ وقوعہ کے روز لگ بھگ تین، سواتین بجے وہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس بالکونی سے بلڈنگ کا صحن بڑا واضح نظر آتا ہے۔ زبیدہ آنٹی کے مطابق، انہی لمحات میں اس نے ریاض احمد کو بلڈنگ کے گیٹ سے نکلتے دیکھا تھا۔“ میں نے سانس درست کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول چوکیدار ایوب کی موت پندرہ اکتوبر کی سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اور یہ وہ وقت ہے جب میرا موکل جائے واردات سے بہت دور کچھ لوگوں میں موجود تھا اور استغاشہ کا گواہ ریاض جائے وقوعہ پر منڈلاتا پایا گیا تھا۔ میں معزز عدالت سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر تھوڑا توقف کیا۔ اس کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”۔۔۔۔۔ میرا موکل بالکل بے گناہ ہے۔ موجودہ زیر سماعت کیس اور اس قتل کی واردات سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ کسی سوچی سمجھی اور گہری سازش کے تحت اسے اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔۔۔ دیش آل یور آنرا!“

”ملزم کی بے گناہی کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے آپ آئندہ پیشی پر صفائی کے تمام گواہوں کو ایک ساتھ عدالت میں پیش کر دیں تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو، اس کیس کا فیصلہ ہو جائے۔“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر وہ انکوائری آفیسر اور وکیل استغاشہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”ساری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس آئندہ پیشی پر استغاشہ کا گواہ ریاض احمد عدالت میں موجود ہونا چاہیے۔ یہ کہیں غائب نہ ہو جائے۔۔۔۔۔؟“

جج کی وارننگ کو مذکورہ دونوں افراد نے سنجیدگی سے لیا اور عدالت درخواست ہو گئی۔ اگلی پیشی ایک روز بعد کی تھی کیونکہ آئندہ روز متعلقہ جج کی عدالت کے پاس صرف ایک ہی کیس تھا لہذا کارروائی کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکتا تھا۔

میری جانب سے پیش کیے جانے والے گواہوں نے حق شہادت ادا کر دیا۔ ان کے بیانات کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا۔ جج کے حکم پر اسی روز ریاض احمد کو شامل تفتیش کر لیا گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کر دیا تھا۔ ریاض نے پولیس کسٹڈی میں حقیقت حال کا اقرار کر لیا۔ یہ قتل اسی نے کیا تھا لیکن اس واردات کے پیچھے پوری ایک جرم زدہ اور سنسنی خیز کہانی تھی۔ الفرید پارٹنٹس کے عقب میں جو اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی ادھر سے دو تین ادبائش مگر بااثر افراد کو دکر الفرید کی چھت پر آ جاتے تھے۔ وہ وہاں بیٹھ کر شراب پیتے، غل غپاڑ اور خرمستیاں کرتے تھے۔ اشرف بھائی کو ان کی یہ نازیبا حرکتیں بالکل پسند نہیں تھیں اس نے چوکیدار کو ان لوگوں کے حوالے سے بڑی سخت ہدایات دے رکھی تھیں۔ وہ اشرف بھائی سے براہ راست الجھے کی کوشش نہیں کرتے تھے البتہ مقتول سے اکثر ان کا لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ چوکیدار، اشرف بھائی کے حکم کا پابند تھا اور وہ لوگ طاقت کے زعم میں اپنی اوجھی حرکتوں سے مجبور۔ اشرف بھائی نے انہیں کئی مرتبہ سمجھایا تھا کہ جو کام وہ الفرید کی چھت پر آ کر کرتے ہیں وہی اپنی بلڈنگ کی چھت پر کر لیا کریں لیکن ان بد مست، بد کردار لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

ہتا نہیں کیوں، ہم گنداکام کرنا بھی چاہتے ہیں اور اس کے اثرات بد سے اپنے گھر کو بھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں!

چوکیدار سے ایک دو مرتبہ ان لوگوں کی بد مزگی اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے اسے مزادینے کا فیصلہ کر لیا۔ ریاض کا بھی ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس نے جب ان کے خیالات سنے تو اس مشن میں کامران علی کو قربانی کا بکرا بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات تھی۔ ریاض کا آئیڈیا سب کو پسند آیا اور قرعہ فال بھی اسی کے نام نکلا چنانچہ اس نے چند روز کی ”مخت“ کے بعد ایک سہ پہر اس منصوبے پر عمل کر ڈالا۔

انسان اپنے مقصد کے حصول کی خاطر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے عمل سے کون متاثر ہو رہا ہے۔ کسی کو مصیبت میں ڈالنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ وہ مصیبت الٹ بھی سکتی ہے۔ بعض اوقات چھری تو وہی رہتی ہے لیکن اس کے نیچے گردن بدل جاتی ہے۔

ریاض کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا تھا!